275
35
3300

علی گڑھ میگزین

٢٣٠٦
١:٥ — ٠٦م

اقبال نمبر

KUTUB KHANA
A.T.U. DELHI
کتب خانہ انجمن ترقی اردو
دہلی

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۶ نمبر ۲	بابت اپریل ۱۹۳۸ء	اقبال نمبر

طلبا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی وادبی سہ ماہی رسالہ

نگران

جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم-اے (لکچرار شعبہ فارسیہ)

ایڈیٹر

محمد ابواللیث صدیقی البدایونی - بی - اے - آنرز (علیگ)

آہ! اقبال

آج اس نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے اور قلم تھرّاتا ہے، آہ کسے معلوم تھا کہ مشرق کی امیدوں کا یہ آفتاب موت کی بدلی میں اس قدر جلد چھپ جائے گا۔ ہندوستان میں مولوی پیدا ہوں گے عالم پیدا ہوں گے، شاعر اور ناظم پیدا ہوں گے فلسفی اور مفکر پیدا ہونگے لیکن دوسرا اقبال پیدا نہ ہوگا۔ اس پر ہندوستان کو ناز تھا بلکہ دنیائے اسلام کے لئے اس کا وجود باعثِ فخر تھا۔

میگزین کی طباعت کے آخری مراحل طے ہوکر شیرازہ بندی شروع ہوچکی تھی کہ ۲۱ اپریل کی شب میں اس سانحہ عظیم کی خبر پہنچی، افسوس کہ علی گڑھ کا یہ ہدیہ عقیدت علامہ موصوف کی بارگاہ میں ان کی حیات میں پیش نہ ہو سکا۔

جس نے مغربیت کے بڑھتے سیلاب کے مقابلے میں اپنے جادو نگار قلم سے سد سکندری قائم کردی تھی، جس کی ذات الحاد اور بیدینی کی عالم گیر وبا میں ہماری محافظ تھی، جس کا وجود ہم تن آسانوں میں جدوجہد اور عمل و استقلال کا انقلاب پیدا کر رہا تھا آج رخصت ہوگیا۔ ہماری امیدوں کا یہ سب سے روشن چراغ تھا جسے موت کے ظالم ہاتھوں نے گُل کردیا۔

کچھ ہی عرصہ پہلے ڈاکٹر سر راس مسعود مرحوم کی وفات پر علامہ موصوف نے جو دردناک اشعار لکھے تھے اس میں فرمایا تھا۔

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم　　　　طلسمہا شکند آں دمے کہ ما داریم

لیکن افسوس کہ ان طلسمات کا شکست کرنے والا اب نظر نہیں آتا۔ وہ ایک مردِ خود

آگاہ تھا جو خود کہہ چکا تھا۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

ندا تیری تربت کو عنبریں کرے، "مہر انور اس پر نور کی بارش کرتا رہے" اور تیرے کلام سے فیض کے امرت کا جو چشمہ جاری ہے اس سے ملت اسلامیہ کو پیغام حیات ملتا رہے۔

"پنچھی اڑ گیا لیکن ڈالی ہل رہی ہے" پیغامبر آیا تھا رخصت ہوا لیکن پیغام باقی ہے۔

قم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور تیرا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ

۲۲ اپریل ۳۸ء

لیث صدیقی

قطعہ تاریخ انتقال ڈاکٹر سر محمد اقبال

(از جناب مولانا احسن صاحب مارہروی)

زندگی کے پیچھے پیچھے یوں لگی آتی ہے موت
جس طرح ماضی کے بعد آمد ہوا استقبال کی

حل ہوں اسرارِ حیات و مرگ مشکل ہے مگر
عام لفظوں میں یہ ہے تفصیل اس اجمال کی

اس سرائے دہر میں جو آئے گا وہ جائے گا
ہر گھڑی ہے یہ منادی وقت کے گھڑیال کی

پائے گی وہ زندگی دنیا میں کیا پایندگی
جو رہے پابند ہو کر چند ماہ و سال کی

ہاں مگر وہ مرنے والا زندۂ جاوید ہے
جس نے چھوڑیں یادگاریں بہترین اعمال کی

بہتریں افعال ہوں یا بہترین اقوال ہوں
ثبت ہے ان پر دوامی مُہر استقلال کی

جسم مٹ کر خاک ہو جاتا ہے لیکن روحِ پاک
مٹ نہیں سکتی کسی خاکستر پامال کی

شاعرِ اقبال مند و سربلند و ہوشمند
دھوم ہے سارے جہاں میں جس کے قیل و قال کی

جس نے پھکوایا خزف ریزوں کو اور اُن کی جگہ
لعل و گوہر سے دُکانِ شعر مالا مال کی

اُٹھ گیا دنیا سے وہ لیکن نہ اُٹھے گی کبھی
دھاک جو بیٹھی ہوئی ہے اس کے استدلال کی

ہے دلیلِ راہ اُس کی شاعری سب کے لئے
پیروی ہوتی رہے گی دہر میں اس چال کی

ہے دعا تربت پر اُس کی پھول برساتی رہے
رحمت اللہ کی الفت رسول و آل کی

کہئے احسن سالِ رحلت اور کیا اس کے سوا
ہے زوالِ علم و حکمت مرگ سر اقبال کی

۱۳ ھ ۵۷

۲۳-۴-۳۸ء

شاعرِ مشرق

علّامہ ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال

کی خدمت میں

علی گڑھ کا ہدیہ عقیدت

(لیث)

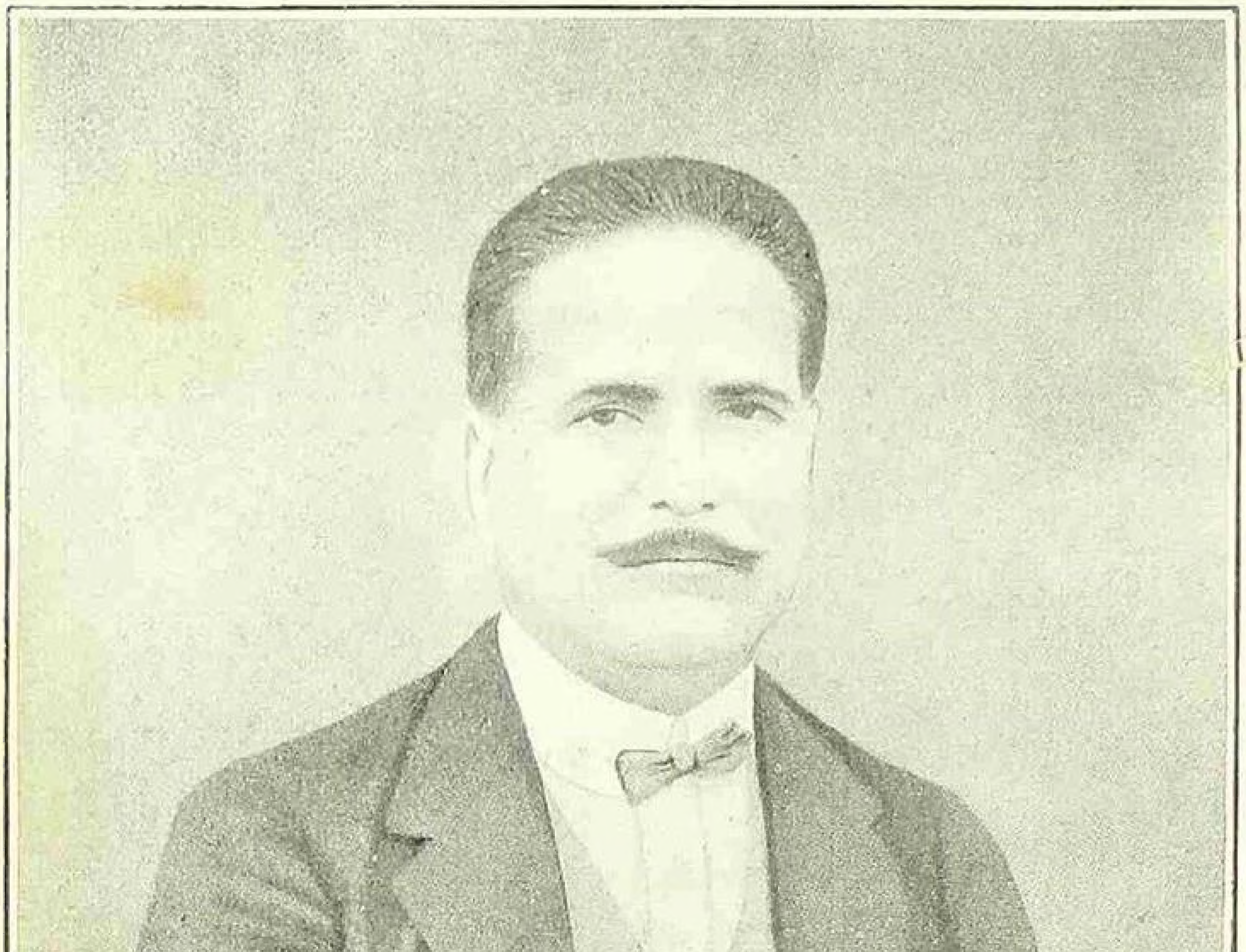

شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	شذرات	ایڈیٹر	۱-۱۳
۲	گرامی نامہ	علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال	
۳	اقبال کی تعلیم	ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم - اے - ڈی فل (آکسن) صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱
۴	پیام اقبال	علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال	۴
۵	اقبال	جناب غلام سرور صاحب ایم - اے (لیڈس) لکچرار شعبہ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵
۶	پیام حقیقت	جناب یوسف رضا صاحب بدایونی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	
۷	نسب و وطن کا اسلامی تخیل بزبان اقبال	جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ایم - اے لکچرار شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ -	۳۷
۸	ڈاکٹر اقبال قومی مصلح کی حیثیت میں	مس تاج بیگم صاحبہ لکچرار فارسی مسلم یونیورسٹی گرلس کالج علی گڑھ	۴۵
۹	انسانیت کے مدارج عالیہ اور اس کے نمونے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظر میں	جناب تجمل حسین صاحب لکچرار ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵۵

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
١٠	اقبال	جناب محمد رضا علی خاں صاحب ایم۔اے ال ال بی (علیگ)	٦٣
١١	اقبال اور عشقِ رسولؐ	جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ایم۔اے لیکچرار شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	٧٧
١٢	بہار نامہ ہندی (نظم)	جناب شیخ عبد الحق صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	٩٣
١٣	اقبال کا فلسفہ جہاد	جناب ظفر احمد صاحب صدیقی۔ ایم۔اے (علیگ) لیکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	١٠١
١٤	اقبال کے معترضین کے جواب میں (نظم)	جناب ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔اے (علیگ) لیکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	١٠١
١٥	اقبال کی نئی شاہراہ	جناب آفتاب احمد صاحب صدیقی ردولوی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	١١١
١٦	اقبال اور اردو غزل	جناب قمر الدین خانصاحب متعلم ایم۔اے ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (انگریزی)	١١٨
	قطعہ	علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال	
١٧	اقبال کے کلام میں عشق کا تخیل	جناب ضیاء احمد صاحب ایم۔اے بدایونی لیکچرار شعبہ فارسیہ نگراں علی گڑھ میگزین۔	١٥٦
١٨	نذر اقبال	جناب مولٰنا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی لیکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	١٦٦

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱۹	قوم کی بنیاد، اقبال اور "قوم" کا تخیل	محمد ابواللیث صدیقی بدایونی بی۔اے آنرز (علیگ) ایڈیٹر	۱۶۷
	تمہید	محمد ابواللیث صدیقی ایڈیٹر	
۲۰	قطعہ	علامہ ڈاکٹر سر محمّد اقبال	۱۷۲
۲۱	قطعہ	جناب محمد اصلح صاحب الحسینی انصاری	۱۷۳
۲۲	قطعہ	جناب شوکت صاحب سبزواری ایم۔اے	۱۷۳
۲۳	قطعہ	جناب علامہ شمس الحق صاحب الشیخ المعقول دیوبند	۱۷۳
۲۴	قطعہ	جناب اقبال احمد صاحب سہیل	۱۷۴
۲۵	قطعہ	جناب بطین احمد صاحب بی،اے۔بی۔ٹی (علیگ)	۱۷۵
۲۶	قطعہ	جناب غلام سجاد صاحب سنبل	۱۷۶
۲۷	قطعہ	جناب مولنا یعقوب بخش صاحب راغب	۱۸۰
۲۸	اقبال (نظم)	جناب حفیظ نقشبندی برہانپوری متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۸۲
۲۹	نقد و تبصرہ	ایڈیٹر	۱۸۳

گرامی نامہ

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

لاہور، ۱۲ دسمبر ۳۶ء

جناب من — ۱. متوجہ

قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہیں علماء الیاس اسلامی تصوف پر مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف ہیں ۔ موجودہ لٹریچر حقیقت میں آپ کے مقصد پورا کرتا ہوں لیکن اس علاوہ کے زمانے میں مسلمانوں کا ایک کوئی ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصوف کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کر سکے ۔ علوم قرون اولیٰ کا روحانیات پر مقدم سمجھتے ہیں مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان خود ہی غلامی پر راضی ہو جاتا ہے تب ہی الٰہی تعلیم سے بیزاری کا سبب پیدا ہوتا ہے کیونکہ جگہ مقصد قوت نفس اور ربط انسانی کا مسلح ہو ۔

۲. اعتراض ہی جواب اساس ہے ... ذیل اسلام جو مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہستی کا مقصود ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے ۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے ۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا ۔ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں دوسری صورت میں قانون الٰہی و اخلاقی کی پابند ہے ۔ بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے ۔ جب احکام الٰہی خودی کی ~~ریاست~~ اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیہ اسلام نے فنا کہا ہے بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے ۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے ۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں

۳. آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے نزدیک جنگ اعلیٰ ہے غلط ہے۔ یہ جنگ کا نام مذہب ہرگز نہیں [illegible] مسلمانوں کے [illegible] مردود سمجھ

کے ہوتے ہوئے اس کا احساس ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے رو سے جہاد یا جنگ صرف دو صورتوں میں جائز ہے حفاظت خود اختیاری اور

[illegible] ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکال دیا جائے مسلمانوں کو تلوار

اٹھانے کی اجازت ہے (نہ کہ حکم) دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے ۹:۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو

غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ وہی چیز ہے جس کو سوسائٹی [illegible] Collective security

کہا ہے۔ قرآن نے اس اصول کو [illegible] اور وضاحت سے بیان کیا ہے [illegible] گزشتہ زمانے میں [illegible] قرآن

[illegible] تو [illegible] زبان [illegible] اقوام [illegible] کئی صدیاں گزر گئی ہیں [illegible] اقوام [illegible] حال کے

[illegible] ہے اس نے تاریخ [illegible] ظاہر کر دیا ہے کہ جمعیت اقوام [illegible] قانون [illegible] [illegible]

[illegible] نہیں نکل سکی ۔ جنگ مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے [illegible] کسی جنگ کو [illegible] ۔ [illegible]

جنگ کرنا قانون اسلام میں حرام ہے [illegible] تلوار اٹھانا بھی حرام ہے

۴. [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] (i) [illegible] (ii) [illegible]

[illegible] (iii) [illegible] (iv) [illegible] ہے ۔

[illegible]

[illegible]

محمد اقبال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۶ نمبر ۲	اپریل ۱۹۳۸ء	اقبال نمبر

شذرات

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو علی گڑھ نے یوم اقبال منایا، اس تقریب میں ایک جلسہ پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مقالوں، نظموں اور تقریروں کی صورت میں ہماری جامعہ والوں نے علامہ اقبال کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا، وہی موتی اب ایک لڑی میں پرو کر اقبال نمبر کے ذریعہ پیش نظر ہیں۔

ہمارا زمانہ کئی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیگا، ایک طرف تو دنیا میں بے اطمینانی اور بے چینی کی جو عام لہر دوڑ رہی ہے اس کا تھوڑا بہت اثر اس ملک کی قدامت پرستی کے باوجود

یہاں کے عام حالات پر پڑ رہا ہے اور جو کشمکش سرمایہ داری اور محنت، شخصی اقتدار اور اشتراکیت، روحانیت اور مادیت کی جنگ کی صورت میں رونما ہوئی ہے یہاں کے عوام بھی اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مشرق میں رہ کر بھی مغرب کی عینک لگا کر واقعات اور حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

دوسری جانب خود ہندوستان کے حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی، ملکی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور لسانی مسائل نے پیچیدہ ہو کر ایسا ہنگامہ پیدا کر دیا ہے کہ اب اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ناممکن ہو گیا ہے، عوام کے لئے اس "خارزار" میں الجھ کر نکلنا اب دشوار معلوم ہوتا ہے، رہے خود ساختہ لیڈر اُن کا اقتدار اور ان کی ذاتی منفعت اسی میں ہے کہ واقعات اسی طرح اُلجھے رہیں۔

جزئیات سے قطع نظر کیجئے تو عام ہندوستانی کی روزمرہ زندگی میں آج دو چیزوں سے انقلاب کے آثار پیدا ہیں یا پیدا ہونا چاہتے ہیں، ایک طرف مذہب اور دوسری طرف سیاست مسلمان اپنے مذہب کو سیاست سے اور سیاست کو مذہب سے جدا نہیں کر سکتے، برادرانِ وطن کا تقاضا ہے کہ مذہب تو رہی انفرادی چیز من حیث القوم ہمیں پہلے ہندوستانی اور پھر ہندو یا مسلمان ہونا چاہیئے۔

مذہبیت کے بھی یہاں بہت سے رنگ ہیں، کچھ لوگوں نے صرف ضد، ہٹ دھرمی، خودغرضی، بغض و حسد، عناد اور کینہ کے مجموعہ کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے، بعض بالکل بے پروا ہیں اور بعض ابھی تک پرانی روحانیت کے قایل ہیں، لیکن اُن کی روحانیت کا نازک جہاز بھی مادیت کی چٹان سے ٹکرا کر اب شکست ہو رہا ہے، سائنس اور فلسفہ کی موشگافیوں نے ان کی بنیادوں کو ایسا کمزور کر دیا ہے کہ اب اس عمارت کا استحکام بعض لوگوں کو دشوار نظر آتا ہے۔

بعض مغربی مفکرین کے فلسفہ بے دینی اور الحاد نے بھی مذہب کے تخیّل کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ تمام تر شکوک اور شبہات کی اصل ان کی تصانیف میں ملتی ہے، اس پر غور و

فکر کرنے کی بجائے بیچارے ہندوستانیوں نے اپنی کم علمی کی پناہ لیکر اس کشمکش کی طرف سے آنکھوں کو بند کر لینا اور کانوں میں اُنگلیاں دے لیناہی مناسب سمجھا ہے، افسوس کہ وہ نہ قانون قدرت سے واقف ہیں اور نہ زمانے کی رفتار پر ان کی نظر ہے جو اپنے تیز دھارے میں ان کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے، جسے اپنے نزدیک وہ پکّی دینداری اور راسخ الاعتقادی سمجھ رہے ہیں اسے مذہبیت کا دم واپسین سمجھئے جو برسرِ راہ ہے۔

رہی سیاست تو یہ بھی ہندوستان میں معجونِ مرکب بن کر رہ گئی ہے، ہندوستان میں اس نے عجیب قسم کی شدت حاصل کر لی ہے، اخباروں اور رسالوں کا آذوقہ جو بغیر اس کے بند رہتا اس کی بدولت کھُل گیا، لیڈروں کے رزق کا سامان بھی رزاق نے اسی بہانہ سے لکھا تھا، مولویوں اور مُلّاؤں نے بھی مذہب اور شریعت کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ مفکرین نے بھی غور وفکر کو ترک کر کے اسی میدان میں اپنے خیال کو قلا بازیاں کھلانا شروع کر دیں، کالج اور یونیورسٹیاں بھی سیاسی اکھاڑے بن گئیں اور قوم کے نونہال خم ٹھونک کر اس میدان میں اتر آئے۔ فلمستان اسی سے آباد ہوا اور سیاسی فلموں کا اس نے ڈربہ کھول دیا۔ فقیروں کی خانقاہ، مُلّا کی مسجد اور مولوی کا مکتب، ایڈیٹر کا دفتر اور وکیل کا بستر سب اسی کے دم سے آباد ہو گیا۔ لیکن اصل سیاست اور حقیقت کو واضح کرنا کسی نے ضروری نہ سمجھا۔

مغرب سے کچھ سوداگر آئے، سیاست اور تدبر کے جال ساتھ تھے، "خارا شگافوں" کو "شیشہ گری" کا فن سکھایا، کالج کھولے تو شاہیں بچوں کو زاغ وزغن کی شریعت سکھائی شیروں کو روباہی کی خو بتائی، پرانے خم کے متوالوں کو تلوری کنٹڑوں کی دعوت دی اور جب دیکھا کہ عالم سرور کا ہے تو تہذیب وتمدن پر ڈاکہ ڈالا۔ حکومت پر چھاپہ مارا، اخلاق پر تصنع کا رنگ چڑھایا، مردوں سے حمیت گئی عورتوں کی غیرت رخصت ہوئی، مرد نے رقص وسرود کو فخر جانا، ماہ طلعتوں نے زلف گرہ گیر

کے دام سے اُردو شعراء کے عاشق کو نجات دلائی، پردے کی کشمکش سے آزادی ہوئی، چلمن جو راہ میں حائل تھی ہٹ گئی اور جن جلوؤں کے لئے نگاہیں ترسا کرتی تھیں اب منظر عام پر دعوت نظر دینے لگے۔

شعر و شاعری کی دنیا بھی زوال کی تاریکی میں گم کردہ راہ تھی، شاعری جو کبھی معجزہ سمجھی جاتی تھی۔ جسد بے روح رہ گئی، شعر شعر نہ تھے الفاظ اور محاورات کے کھلونے تھے جن سے نادان شاعر کھیلتے اور دل بہلاتے، یا تو وہی پرانے گلے شکوے، وہی پرانی حکایت وہی فرسودہ داستان یا پھر انسان کی مجبوری اور عاجزی، دنیا کی بے ثباتی حرکت و عمل سے بیزاری، جد و جہد سے فرار، جمود اور سکون کی تعلیم۔

افلاطونی تعلیم، بدھ مت پرچار اور ویدانت فلسفہ نے "نہ ہونے" میں ہونا کی تعلیم دی تھی، خود کو فنا کرو خودی کو مٹاؤ، خودی کے ساتھ قوت عمل بھی رخصت ہوئی جد و جہد کی جگہ تن آسانی نے لی، اُبھرنے والی قومیں ڈوبنے لگیں، دنیا پر زوال آیا۔

ان حالات میں ایک مصلح، ایک مجدد، ایک مفکر، ایک معلّم، ایک محرک، ایک شاعر، ایک قلندر کی ضرورت تھی، عرب اس سے خالی تھا، عجم اس سے خالی، ہندوستان کی محفل سونی تھی کہ پھر کوئی شوریدہ سر، آتش نوا، پیدا ہو، جس کی شاعری معجزہ ہو جس کے کلام میں بجلیاں جس کی زبان تیغ سے زیادہ آبدار ہو، جس کی نگاہ عقاب سے زیادہ دور بین، جو دور انقلاب کی پیداوار ہو خود بڑا انقلابی اور ایک نئے انقلاب کا قاصد، جو قومی مصلح بھی ہو اور اسلام کا مبلغ بھی، جو عالم بھی ہو اور علم کی حقیقت بھی جانتا ہو، جو سیاست داں بھی ہو اور سیاست کے بازار میں کھرا کھوٹا پرکھنے والا جوہری بھی، جو محدود عشق کے دائرے سے آزاد بھی ہو اور ایک لامحدود عشق میں گرفتار بھی، جس

نے مغرب بھی دیکھا ہو اور مشرق بھی، جو اصل کا سومناتی ہو کر بھی لات و منات کو شکست کرے، جس کا نغمہ ہندی ہو اور لے حجازی جو اسلام کا مورخ بھی ہو اور درخشاں مستقبل کی تاریخ کا بنانے والا بھی۔

ہندوستان کو ایسے فوق البشر کی ضرورت تھی مسلمان اسی کے انتظار میں بے چینی کی گھڑیاں گزار رہے تھے، قافلہ گم کردہ راہ تھا۔ کان بانگ درا پر تھے، میدان جنگ سامنے تھا ضرب کلیمی درکار تھی۔ جنبش سامعہ تشنہ نوائے الہام تھا بال جبریل کی حاجت تھی۔

مشرق سے یہ آفتاب اُبھرا، گراں خوابی کا دور گیا، ہندوستان کی سرزمین سے اقبال پیدا ہوا، مغرب کے ساحروں کا سحر باطل ہوا، مشرق کو اس طلسم سے نجات کا پیغام ملا۔ مُردوں میں جان پڑی، جمود و سکون میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے۔

اے بہار کے پیغامبر تیرا آنا مبارک، اے درخشاں مستقبل کے قاصد خوش آمدید۔

میرا مقصد نہ علامہ موصوف کی شاعری پر تنقید کرنا ہے اور نہ میں ان کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں مجھ سے بہتر لوگوں نے اس فرض کو ادا کر دیا ہے اور ہر ممکن پہلو سے ان کی شاعری اور اس کے اجزاء پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے میں صرف چند الفاظ اشارتاً کہنا چاہتا ہوں۔

اقبال کی تعلیم کا سب سے اہم جزو "اثبات خودی" ہے، موصوف کے اس فلسفی نکتہ نے منکرین کے سامنے عمل کی ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے، افلاطون کی اس تعلیم کا گہرا اثر ہر مفکر کے دماغ پر کارفرما نظر آتا ہے۔

گفت سرّ زندگی در مردن است	شمع را صد جلوہ از افسردن است
کار او تحلیل اجزائے حیات	قطع شاخِ سرو رعنائے حیات

فکر افلاطوں زیاں را سود گفت — حکمت او بود را نابود گفت،
بسکہ از ذوق عمل محروم بود — جان او وارفتۂ معدوم بود،
آہوش بے بہرہ از لطف خرام — لذت رفتار بر کبکش حرام،
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش — از تپیدن بے خبر پروانہ اش،

اقبال اس تعلیم سے بیزار ہیں جس نے خودی کی نفی سے انسان کو اپنی کمزوری کا غلط یقین دلایا اور قوموں کو زوال کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیا، خودی کے رتبہ سے وہ "گوسفندے در لباس آدم" ناواقف تھا۔

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے، — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

انسان کو اپنی قوتوں کا اظہار اور نمود کرنا چاہیے

وانمودن خویش را خوئے خودی است — خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

کیونکہ

بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی کی موت ہی زوال کا اصلی سبب ہے

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب وتاب — بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و نظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور — کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہ احرام

لیکن اس خودی کو قانون الٰہی کا پابند ہونا چاہیئے اور خودی کی ترقی اسی میں مضمر ہے، اگر یہ خودی

قانونِ الٰہی کی پابند نہ رہے تو خود غرضی اس کی موت ہے۔

دوسرا اہم نکتہ ذوقِ عمل ہے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو ساحل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں، — محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ تعلیم علامہ موصوف کے فارسی اور اردو کلام میں ہر جگہ موجود ہے اور ان کی تعلیمات کا اہم جزو ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجِ ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

مسلمانوں میں سب سے بڑی قوت یہی عمل اور جدوجہد کی تھی جس نے اٹھارہ سالہ نوجوان طارق کے قدموں پر ہسپانیہ کے مغرور شہنشاہ کا سر جھکا دیا، اسی نے بیس سالہ محمد فاتح قسطنطنیہ کے گھوڑے کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ تک پہنچا دیا، اسی نے تپتے ہوئے صحراؤں اور زخار سمندروں میں اُن کی ہمت کو پہاڑوں سے زیادہ اٹل کر دیا، مغرب ان کے زیرِ نگیں آیا۔ مشرق پر اُن کا پرچم لہرایا، بقول مولانا شبلی سکندر اور دارا جب سفر کرتے تھے تو لاکھوں اور کروڑوں سپاہی خدام اور لشکر کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تب کہیں معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ جا رہا ہے اور مسلمانوں کا تنہا خلیفہ[1] جب نکلتا" تو ایک شور ہوتا کہ عالم کا مرکزِ ثقل جنبش میں آگیا ہے"

---

[1] حضرت عمر فاروق رض

ان کے ذوق عمل کا مظاہرہ صرف میدان جنگ تک محدود نہ تھا، علم و ادب شعر و فن بھی ان کے دامن میں نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں پرورش پاتے تھے وہ صاحب سیف تھے اور صاحب قلم بھی وہ صاحب تخت تھے اور صاحبِ کتاب بھی یونانیوں نے علوم و فنون کے بیشک دریا بہائے تھے لیکن اب ان میں گدلے پانی کے سوا اور کچھ باقی نہ تھا، مسلمانوں نے طلب علم کو اپنا مذہبی فرض سمجھا، حکم ہوا کہ علم حاصل کرو خواہ چین میں ہو،[1] چنانچہ جب یورپ جسے آج اپنے علوم و فنون پر بڑا ناز ہے بربریت اور جہالت میں مبتلا تھا، جب تعلیم و تدریس کو لوگ باعثِ شرم سمجھتے تھے۔ وحشیانہ عادات اطوار اور خصائل کو مردانگی کا اظہار جانتے تھے اس وقت مسلمانوں نے اپنے عمل سے ہدایت کی وہ مشعل روشن کی جس سے یورپ نے استفادہ کیا، متعصب مورخ خواہ تسلیم نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ علوم و فنون کی جس قدر ترقی اور سرپرستی مسلمانوں نے کی دنیا میں کوئی دوسری قوم اسکی مثال پیش نہیں کر سکے گی، قرطبہ یونیورسٹی اب باقی نہیں مگر ہسپانیہ کے کھنڈر مسلمانوں کے اس دور پر اب بھی گواہ ہیں۔ لیکن صدیوں کی حکمرانی نے انھیں بھی تنعم سے آشنا کرا دیا اور وہ زندگی کی کشمکش کو کنار ساحل سے دیکھنے لگے 'مقام راہ' کو انھوں نے 'منزل' سمجھ لیا اور یہیں سے وہ بلندی کی بجائے پستی کی طرف گرنے لگے، ان میں اگر کوئی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور اقبال کا ایمان ہے کہ یہ انقلاب ہو کر رہیگا۔ تو پھر عمل اور جدوجہد کی طرف واپسی سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اقبال کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تن آسان مردوں کو ذوق عمل سے آشنا کرایا۔

اقبال مسلمان کو ایک 'فرد کامل' دیکھنا چاہتا ہے، اُس کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ

---

[1] اشارہ حدیث شریف اطلبوا العلم ولو کان بالصین،

ہو چکا، مزید تفصیل خود شاعر کی زبان سے سنئے۔

تنے پیدا کن از مشت غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے،
درون او دلِ درد آشنائے — چو جوئے در کنار کوہسارے،

مومن کی شان یہ ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مسلمان کو خودی اور ذوقِ عمل کی تعلیم کے بعد وہ اجتماعیت کیطرف لیجاتے ہیں، اسے اُن کا فلسفہ بے خودی سمجھئے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو مستحکم اور مضبوط کر کے خود کو جماعت میں گم کر دے تاکہ اُس کا وجود قائم رہ سکے، کیونکہ انفرادی حیثیت سے دنیا میں وہ کچھ نہیں کر سکتا اور جماعتی حیثیت سے وہ ایسی طاقت کا مالک ہو سکتا ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش، — رونقِ ہنگامہ احرار باش
حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود، — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم — ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

چنانچہ ان کے اسی خیال پر بعض لوگ انھیں پین اسلامزم کا مبلغ بتاتے ہیں کچھ عرصہ سے اسلامی ممالک میں بھی قوم کا جغرافیائی تخیل اسلام کے عالمگیر تخیل کی جگہ لے رہا ہے، سبب اس کا یہی ہے کہ مسلمان اسلام کی اصلی تعلیم سے دور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ نوجوانوں کی موجودہ نسل اس

سے قطعی بے بہرہ ہے، ممالک اسلامی میں یہ جغرافیائی تقسیم نہ خود مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے لئے مفید ہے اور نہ اسلامی طاقت کے اجتماعی نظام کو اس سے کچھ تقویت ہے۔ بعض دوستوں کا قول ہے کہ عرب اور ٹرکی کے مسلمانوں کو ہند کے مسلمانوں سے کچھ دلچسپی نہیں اور نہ وہ ان کے لئے کوئی جد وجہد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ ایران، عراق اور ٹرکی کا جو معاہدہ یورپ کو سال گذشتہ لرزہ براندام کر رہا تھا اس بکھرے ہوئے اور منتشر نظام کو پھر ایک شیرازے میں منسلک کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمان کے متعلق پہلا عقیدہ یہی ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است — کہ ما پروردۂ یک شاخساریم

ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام کے پیش نظر اور مستقبل کے انقلاب کو سامنے رکھ کر اقبال کی سیاسی تعلیم بھی کم اہم نہیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے جدا کرنا ان کی شریعت میں جائز نہیں۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دین — کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی سے آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دوسرا سوال وطنیت سے متعلق ہے۔ گذشتہ ماہ میں اس مسئلہ نے جو صورت اختیار کر لی اُس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس کی مزید تفصیل آپ کو ان ہی صفحات میں کہیں ملے گی

مولوی حسین احمد دیوبندی نے اپنی ایک تقریر میں بتایا تھا کہ قوم کا تخیّل جغرافیائی حدود پر قایم ہوتا ہے، اس کا جواب علاّمہ موصوف نے اپنی تعلیم کے مطابق یہ دیا۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ، — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اس پر جو بحث ہوئی اس کی یہاں گنجائش نہیں[1]۔ لیکن علاّمہ اقبال وطنیت کے اس تخیّل سے بیزار ضرور ہیں جو ایک علاقہ میں رہنے والے افراد کو دوسرے علاقہ کی جماعت کا حریف اور مقابل قرار دیتا ہے، یہی وطنیت تنگ نظری اور تعصب کا روپ بھر کر انسان کے خون کو پانی سے بھی ارزاں کر دیتی ہے، دنیا آج اس سے بیزار ہے لوگ (Cosmopolitanism) پر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں لیکن اسلام کی تعلیم اب سے چودہ سو سال پہلے یہی بات بتا چکی ہے۔

وطنیت کے علاوہ علاّمہ موصوف جمہوریت، اور اشتراکیت سے بھی بیزار ہیں۔ جمہوریت کے متعلق لکھتے ہیں۔

متاعِ معنیِ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی — بہ موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید،
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

فرانس اور امریکہ کی جمہوریت اس صداقت پر گواہ ہیں۔

اشتراکیت کی انتہا پسندی سے وہ بدظن ہیں، مزدور اور دہقان کے مصیبت پر اُن کا دل بھی

---

[1] ملاحظہ ہو "اقبال" اور "قوم کا تخیّل"

دکھتا ہے مگر تقسیم دولت کی جو صورت اشتراکیت بتاتی ہے وہ اسے قبول نہیں کرتے ورنہ کہتے وہ بھی ہیں جو ہر مسلمان کو کہنا چاہیئے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

میں ناخوش و بیزار ہوں مَرمَر کی سلوں سے
میرے لئے مٹّی کا حرم اور بنادو

اقبال کی تعلیم کے دیگر اجزا خودداری۔ یقین محکم، استحکام ملّت وغیرہ ہیں، خودداری کے متعلق ارشاد ہے۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

یا

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آزاد ہو

یا

تا توانی کیمیا شو گِل مشو
در جہاں منعم شو و سائل مشو

ان کے تمام فلسفہ اور تعلیم کا لب لباب "رجائیت" ہے، خود فرمایا ہے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

اے مسلم دل خستہ مصائب سے نہ گھبرا
خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے

میرا مقصود علّامہ موصوف کی شاعری اور فلسفہ کا جائزہ لینا نہ تھا۔ اس کے لئے یہ مختصر جگہ کافی نہ ہوتی، علاوہ بریں ان مضامین میں جو آگے آئینگے آپ کو علّامہ موصوف کی تعلیم اور فلسفہ کے ہر پہلو پر

کچھ نہ کچھ بہترین انداز میں ملے گا جس کے لئے میں خود انہوں کا مشکور ہوں جنکی تائید نے اس نمبر کو کامیاب بنا دیا۔

آخر میں میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ علامہ موصوف کو صحت کلی عطا فرمائے تاکہ آپ ملت اسلامیہ کی رہنمائی اور رہبری میں مستعدی سے اپنی خدمت انجام دے سکیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ علامہ موصوف کے چند کلمات خیر اس نمبر کے لئے حاصل کریں گے اور ہمیں اس کا یقین کامل تھا لیکن آپ کی علالت نے اس کا موقع نہ دیا۔

لیکن اس مرتبہ آپ کا ایک گرامی نامہ شائع ہو رہا ہے جو آپ کے فلسفہ جہاد کا خلاصہ اور معترضین کے شکوک کا باصواب جواب ہے۔ اس کی اہمیت آپ پڑھنے کے بعد خود محسوس کرینگے، ہم ظفر احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ آپ نے یہ خط ہمیں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا۔

رسمیات کا میں قایل نہیں ورنہ شکریہ بہت سے عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کا ادا کرنا ہے جن کی تائید کے بغیر اس کا انجام پانا دشوار تھا۔

لیث صدیقی

مارچ ۱۹۳۸ء

"پیغامِ حقیقت"

محمد یوسف رضا صاحب بدایونی

جمیعِ ہند کی آشفتہ حالی — "غدر" کے بعد سے ناگفتہ بہ تھی
مسلمانوں کی حالت نحس تر تھی — ابھی برہم ہوئی تھی بزم ان کی
دماغوں میں گذشتہ شان و شوکت — نظر میں نقشۂ دَورِ حکومت!
وہی اطوار تھے، عادت وہی تھی — عنانِ سلطنت گو چھن گئی تھی!
مخالف تھا ہر اک اپنا پرایا — سروں پر نکبت و ذلت کا سایہ!
تکدّر نیّت ابنائے زَمَن کی — عناد آمیز خواہِل وطن کی!

یہ کیفیت اگر پیشِ نظر ہو
نہ کیونکر قلب شاعر نوحہ گر ہو؟

یہ باعث تھا جو حالیؔ نوحہ خواں تھا — انہیں جذبات کا وہ ترجماں تھا
زوالِ قوم پر سرفِ بُکا تھا — ہر اک شعر اس کا "قومی مرثیہ" تھا!

پھر اس کے بعد آیا وہ زمانہ — کہ حالت جس میں تھی امید افزا
ہوئی تب فکر یہ اربابِ دل کو — بھلا دیں ہنس کے رنجِ جاں گسل کو
کہا دل نے یہ معنی گستروں سے — نکالو کام "شیریں نشتروں" سے!
جو دل پژمردہ ہوں بھڑکاؤ اُن کو — مزاحاً چھیڑ کر چونکاؤ اُن کو

رَوِش یہ اکبرِؔ مرحوم کی تھی
مزاح و طنز میں تھی نکتہ چینی!

مگر قدرت نے جب یہ حال دیکھا | کہ مُسلم خوابِ غفلت سے نہ چونکا
دعا خالی گئی ہر "اہلِ دل" کی | نہ کار آمد ہوئی تدبیر کوئی
صدا یہ عالمِ بالا میں گونجی | کہ "مرضی ہے یہ ربُّ العالمین کی
کہ ہو تخلیق ایسا انقلابی | کرے جو دُور آثارِ خرابی
نفس میں جس کے ہو آتش نوائی | سخن میں جس کے ہو معجز نمائی
مسلمانوں کو جو ہوشیار کر دے | دلوں کو جذبۂ قومی سے بھر دے
بھرا ہو یہ اثر اُس کے قلم میں | کہ برپا کر دے محشر ایک دم میں
اثر ہو یہ زبانِ سحر فن میں | حرارت پھونک دے ہر موئے تن میں
نکالے کام نشتر کا زباں سے | رگِ خوابیدہ کو بیدار کر دے!"

"بنایا جائے جب اُس کا ہیولیٰ | خلاصہ ہو کمالاتِ جہاں کا
حکیمانہ رَوِش ہو نٹشے کی | ہو گیٹے کے تخیّل کی بلندی
قلم میں حق نگاری ٹیگور کی | بیاں میں کیٹس کی رنگیں طرازی
مُجسّم شعریت ہو مثلِ شیلی | چسک آہ و فغاں میں بائرن کی
اثر سعدیؔ کا، فردوسیؔ کا انداز | نوائے دل نشیں میں میرؔ کا ساز
محاکاتِ انیسؔ وسُوزِ حالیؔ | اسدؔ کی آسماں رس فکرِ عالی"

مُرتّب جب ہوئے یہ سب عناصر | ہوئی تخلیقِ جسم و روحِ شاعر
ملائک بہرِ نظارہ جو آئے | معاً فق ہو گئے حیرت سے چہرے
کیا یہ عرض ربُّ العالمین سے: | کہ "یہ تشویش ہے دل کو ہمارے

"بلا کا سحر ہے اس کی زباں میں
دُفورِ انقلابیت بیاں میں!
"کہیں یہ منقلب عالم نہ کر دے!
جہاں کو درہم و برہم نہ کر دے!"
جواب آیا کہ "تم واقف نہیں ہو!
یہ بھیجا جائے گا ہندوستاں کو
وہاں مُسلم ہے محوِ خوابِ غفلت
تن آسانی میں ہے مشہورِ خلقت
غریقِ نکبت و افلاس ہے وہ!
خدا کے فضل سے بے آس ہے وہ!
یہ بھیجا جا رہا ہے اس غرض سے
کہ اُس کو خواب سے بیدار کر دے!"

یہ ہے اقبال کی خلقت کی غایت
کلام اُس کا ہے "پیغامِ حقیقت"

نسب ووطن کا اسلامی تخیّل بزبانِ اقبال

(جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ادارۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

وطن کی خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدّس ومحبوب ہے جس زمین سے انسان کا مایۂ خمیر اٹھے جس سرزمین پر سنہرا بچپن اور رسیلی جوانی بسر ہو جس ملک کی زمین انسانی مشتِ خاک کی سرمایہ دار ہو اُس کی دلکشی ومحبوبی میں کون شک لانے والا ہے اور شک لانے والے کے لئے حضور خواجہ دوجہان کا ارشاد حبّ وطن من الایمان ایک برہان قاطع اور ایک فیصلہ ناطق ہے پس ایک بندۂ مومن کے لئے وطن ایک مقام عزیز ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہے اُن کا تخیل، اُن کا دل، اُن کی زبان، متاع اسلام ہیں اور حقیقت میں اُن کے کلام کا جز وغالب ایک منظوم تعلیم اسلام ہے۔

نیا شوالہ اور میرا وطن نہایت تابدار نظمیں ہیں ان کے علاوہ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں جابجا حسیات ومحبت وطنی کا اظہار ہوتا ہے اور وطن کی بے حسی اور غلامی کا ماتم تو اس عمر میں بھی قائم ہے۔

مجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں — عبادت چشم شاعر کی ہے ہردم باوضو رہنا
دکھادونگا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو — کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کرکے چھوڑونگا

ہندوستان کی نا اتفاقی اور اُس کے لازمی نتیجہ کو دیکھ کر فرماتے ہیں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

ہندوستان میں غلامی اور بے آبروئی کی زندگی اُن کو دوبھر ہے اور اس کا ماتم آج تک جاری ہے۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا — چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

پیام مشرق کے انتساب منظوم میں گوئٹے اور اقبال کے وطن کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

او چمن زادۂ چمن پروردۂ — من دمیدم از زمینِ مردۂ

شکر و شکایت کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے انعام و افضال کے شکریہ کے بعد یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ

ع رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

شکایت ہے تو اس امر کی

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اسلام ایک بے پناہ قلبی و ذہنی قوت ہے اور تاریخ عالم کا سب سے بڑا انقلاب اُسی ہی کے تخیلات کا مرہون پس ناممکن ہے کہ مسلمان کی نظر ایک تودۂ خاک میں اُلجھ کر رہ جائے۔ علامہ اقبال کی عمر کے ساتھ اُن کی بالغ نظری بڑھتی گئی اور اسلامی رنگ غالب آتا گیا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے مغرب کی اس فسوں کاری کو سمجھ لیا اور انسانیت کے لئے وطن کی بت کی پرستش کو بجا طور پر زہر قاتل قرار دیا اور مسلمان کو یاد دلایا کہ خدا کی ساری خدائی اُس کا وطن اور اُس کی برادری ہے۔ اسلام نے تمام بتوں کو توڑ کر اُس کے قدموں پر ڈال دیا لیکن ع

دما دم نو خداوندے تراشد — کہ بیزار از خدایانِ کہن هست

انسان نے رنگ و ملک و نسب کے ٹوٹے بتوں کے ٹکڑوں کو پھر جوڑا ہے اور انہی بتوں کا توڑنا مسلمان کے فرائض سے ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے — هر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب　　　　نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند　　　　پیش پائے ایں بتے نا ارجمند

وطن کے تخیّل نے بنی نوع انسان کی ہلاکت و تباہی کی صورت اختیار کرلی ہے اُس کا ماتم قابل دید ہے

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　　　　بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند　　　　نوع انساں را قبایل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد　　　　آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　　　　آدمیت گم شد و اقوام ماند،

مسلمانوں کو یہ تعلیم عہد حاضر میں ملک اور بیرونِ ملک سے ملتی رہی ہے دونوں قسم کے معلّموں کا مقصد مسلمان کی نگاہ کو عالم اسلام سے کاٹ کر ایک شورزار میں الجھا دینا تھا۔ ہندوستان کی قومیت جدیدہ کی تعمیر میں سب سے پُرجوش نعرہ ہم ہندوستانی پہلے ہیں ہندو یا مسلمان بعد میں، قرار پایا اور کوشش یہ کی گئی کہ مسلمان کے دل سے خدا کی خدائی کو اپنا سمجھنے کا نور بجھ جائے۔ اقبال نے اس فلسفہ اور سیاست کا ردِ عمل بہم پہنچایا اور مسلمان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا اور مختلف اوقات میں فرمایا۔

ہے اگر قومیتِ اسلام پابند مقام،　　　　ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے　　　　غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے — اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

پیرِ رومی کا فیصلہ:۔

اقبال نے زمانہ حاضر کے بعض مسائل مہمہ کو جناب مولانا رومی اور بقول اُن کے مرشدِ رومی کے حضور میں بحیثیت مریدِ ہندی پیش کرکے اُن سے فیصلہ چاہا ہے۔

مریدِ ہندی دریافت کرتا ہے

تا کجا آویزشِ دین و وطن ، — جوہرِ جاں پر مقدم ہے بدن ؟

پیرِ رومی کا فیصلہ ہے

قلب پہلوی زند با زر شب — انتظارِ روز می دارد ذہب

ارشاد ہوتا ہے

شرِ مغرب آں سراپا مکر و فن — اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک — تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آں کہ گفت اللہ ہو — در حدودِ ایں نظامِ چار سو

انسان صرف ایک مشتِ خاک ہی نہیں جانِ پاک بھی رکھتا ہے اور جانِ پاک کی ضروریات جسم پر مقدم ہیں کیونکہ جان ہی سرمایۂ شرافت اور پیرایۂ سعادت ہے۔

پرکہ از خاک و برخیزد ز خاک — حیف اگر در خاک میرد جانِ پاک
گرچہ آدم بردمید ان ز آب و گل — رنگ و نم چوں گل کشید از آب و گل
حیف اگر در آب و گل غلطد مدام — حیف اگر برتر نہ پرد زیں مقام

گفت تن در شو بخاکِ رہگذر　　گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند　　مردِ حُر بیگانہ از ہر قید بند
حُر ز خاکِ تیرہ آید در خروش
زانکہ از بازاں نیاید کارِ موش

انسانی فطرت عالمگیر ہے مشرق و مغرب کی گتھیاں ہمارے اوہام باطلہ کی پیدائش ہیں

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن　　ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است　　زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر　　نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب　　با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں　　تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست　　تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ اُو از روئے نسبت خاوری است

مسلم استی دل با قلیمے مبند　　گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم　　در دلِ او یاوہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در پہنائے دل
می شود گم ایں سرائے آب و گل

ہجرت نبوی اور مفہوم وطن کا تعلق یوں واضح فرمایا ہے۔

عقدۂ قومیت مسلم کشود،　　از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد،　　بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطان دیں ۔۔۔ مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود ۔۔۔ آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش ۔۔۔ لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت ۔۔۔ تو گماں داری کہ از اعدائے گریخت
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند ۔۔۔ معنیِ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ۔۔۔ ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنی او از تنک آبی رم است ۔۔۔ ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو ۔۔۔ یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد ۔۔۔ چوں فلک در شش جہت آباد شد

اردو میں اس خیال کو مدتوں پہلے زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا تھا۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔۔۔ رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی ۔۔۔ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ۔۔۔ ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ۔۔۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے تو اس سے ۔۔۔ قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے تو اس سے

ملت اسلامیہ کی وحدت پر ارشاد ہوتا ہے

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم ۔۔۔ چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است ۔۔۔ کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی،
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اوّل آدم بے رنگ و بوئیم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم ،
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما ،
شبنم یک صبحِ خندانیم ما ،
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم
در جہانِ مثلِ مے و میناستیم
چوں گل صد برگ ما را بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

اے کہ یکجا در چمن انداختی
مثلِ بلبل با گلے در ساختی
چوں صبا بارِ قبول از دوش گیر
گلشن اندر حلقۂ آغوش گیر

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش
رہ فتد اے رہرو ہشیار باش

نسب کے غرورِ باطل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اسلام مسلمان کا سب سے بڑا شرف ہے مسلمانوں میں یہی سب سے بڑا رشتہ اور نسب ہے

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است
ملّت ما را اساس دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغایب بستہ ایم
پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم
رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است
چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما
یک نما یک بیں یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست ،
طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یکجاں شدیم

جن لوگوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد غرور کو رکھا ہے اُنھوں نے اسلامی تعلیم کی حقیقت سے حصہ نہیں پایا۔

خویشتن را تُرک و افغاں خواندهٔ، — وائے بر تو آنچہ بودی ماندهٔ،
فارغ از ارباب دام و اعمام باش — ہمچو سلماں زادهٔ اسلام باش
گر نسب را جزو ملّت کردهٔ — رخنہ در کارِ اخوت کردهٔ
عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتہ عشق از نسب محکم تر است
تو اے کودک منش خود را ادب کن — مسلماں زادهٔ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست — عرب نازد اگر ترکِ عرب کن
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وحدتِ ملّت حیاتِ ملّت کے لئے ضروری ہے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر
یہ ہندی یہ خراسانی یہ افغانی و تورانی — تو اے شرمندهٔ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودهٔ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

ڈاکٹر اقبال قومی مصلح کی حیثیت میں

(مس تاج بیگم صاحبہ لکچرار فارسی
مسلم گرلس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ڈاکٹر اقبال بحیثیت قومی شاعر ہونے کے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے مایۂ فخر و ناز ہیں۔ وہ شاعر کے لباس میں قومی ریفارمر ہیں۔ اُن کی شاعری نام ہے اُن احساساتِ درد ملّت کا۔ اُن جذباتِ غم قوم کا۔ اُس سوز و گداز کا جو کبھی نا لہا ئے بلبل کی طرح فضائے عالم میں منتشر ہو کر اسلام کے خزاں دیدہ گلستان کی بہار رفتہ پر نوحہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی گدازِ شمع کی مانند بزم اسلام کی بے رونقی پر اشک فشانی۔ لیکن با ایں ہمہ اُن کی شاعری صرف قوم کی گذشتہ شان و شوکت کا مرثیہ اور موجودہ زبوں حالی کا نوحہ لکھنے تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ بحیثیت قومی مصلح کے وہ ان متضاد حقیقتوں کے علل و اسباب پر بحث کر کے بتاتے ہیں کہ ماضی میں عروج اسلام کا باعث کیا تھا اور موجودہ نگونساری کی وجہ کیا ہے۔

قوم کے شاندار ماضی کے تذکرے ابھی زبان عالم سے فراموش نہیں ہوئے تھے لیکن حال کی پستی و ادبار کی بھیانک تصویر بھی سامنے تھی۔ ہمارا ذکی الحس شاعر درد قومی سے تلملا اُٹھا یہی غم ملّت کے جذبات اُس کی قومی شاعری کا سرچشمہ ہیں۔ اُن کا وسیع مطالعۂ اسلامیات اُن کے دل میں ان جذبات کی تحریک کا باعث ہوا۔ اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ کا ہر ورق مسلمانوں کی گذشتہ شوکت کی داستانیں سنایا کرتا ہے اقبال نے بھی ان داستانوں کو سنا لیکن عام سامعین کی طرح سن کر فراموش نہ کر دیا۔ اور فراموش کیونکر کرتا جبکہ ایک طرف خود حساس دوسری طرف داستانیں ولولہ خیز اور پھر لطف یہ کہ داستانیں افسانہ نہ تھیں۔ حقیقت تھیں۔ صداقت پر مبنی تھیں۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کے صدہا تاریخی مقامات سربفلک عمارات اور خوبصورت مساجد کی صورت میں ان داستانوں کی صداقت پر گواہ تھے۔ گواہ ہیں اور گواہ رہیں گے۔

ان چیزوں نے اس حساس مسلمان کے دل میں ملی جذبات کا سیلِ بے پناہ پیدا کر دیا یہی جذبات قیام یورپ کے اختتام پر اُس کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کا باعث بنے۔ سفر یورپ سے پیشتر وہ ایک شاعر تھے۔ قادر الکلام۔ فصیح البیان۔ رفیع التخیّل۔ شیریں سخن۔ سب کچھ تھے۔ لیکن صرف شاعر۔

اُس وقت تک اُن کے رخشِ خیال کی جولانیاں حسن وعشق یا اِس سے کچھ آگے وطنیت کے تنگ میدان میں محدود تھیں۔ لیکن سفرِ یورپ اور قیامِ یورپ کا زمانہ اُن کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس زمانہ میں انھوں نے دنیا بھر کے نئے اور پرانے فلاسفروں کے خیالات کا مطالعہ کیا۔ اِس وسیع مطالعہ اور تحقیق نے نہ صرف یہ کہ اُن کی عام واقفیت اور قابلیت میں ہی اضافہ کیا بلکہ اُنھیں خود بھی مفکر و مجتہد فلسفی بنا دیا۔ اِسی زمانہ میں اُنھوں نے فلسفہ و علوم اسلامیہ کا بھی مطالعہ کیا اور اِس طرح تفکر و اجتہاد کے آغاز کے ساتھ ہی اُن میں احساس قومی بھی پیدا ہو گیا۔ ان چیزوں نے اُن کی تخیل کو عام شاعری کی تنگنائے سے نکالکر غم ملّت کی وسعت غیر محدود میں داخل کر دیا۔

اِس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے۔ ایک طرف اسلام کی شاندار روایات۔ دوسری طرف ذلّت و خواری۔ ایک طرف آدھی دنیا پر حکومت دوسری طرف غلامی۔ وہ دینی و دنیاوی دولت کی افراط اور یہ بے دینی لامذہبی کیساتھ افلاس و ناداری اتنی متضاد حقیقتیں تھیں جنکی تہ تک پہنچنے کیلئے اِس قومی مصلح کا فلسفیانہ دماغ پوری قوت کیساتھ مصروفِ کار تھا۔ مسلمانوں کا گذشتہ عروج کن محاسن کا رہینِ منت تھا اور موجودہ نکبت کن مصائب کی پاداش میں ہے؟ یہ دو سوالات تھے جو اُسکے تمام تر تفکر و اجتہاد کا مرکز تھے۔ سوز دردِ ملت تو ایک عرصہ سے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ بلکہ بڑھتے بڑھتے وہ داغ بن چکا تھا جس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ ۔۔۔ چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

لیکن یہ سوز یہ تڑپ جس نے ان کے خیالات کی رد کو پلٹ دیا۔ اُن کی شاعری کی صورت ہی بدل دی اِس کے فوری محرکات کیا تھے؟ سفرِ یورپ کے دوران میں اُنھوں نے وہ مقامات دیکھے جو صدیوں تک حجازی تہذیب کا مرکز رہ چکے تھے۔ جنھیں نشۂ اسلام سے مخمور بہادر غازیوں نے اپنے ایمان کی برکت اور قوت بازو سے تسخیر کیا تھا۔ جہاں علمِ اسلام صدیوں تک لہرا لہرا کر خدائے واحد کی عظمت و جلال کا اظہار کرتا رہا۔ کفرستانِ یورپ میں یہ مقامات صدیوں تک نورِ اسلام کی ضیا پاشی کرتے رہے لیکن

اب.. اب ان مقامات پر وہی کفر کی تاریکی تھی۔ ضلالت کی ظلمت تھی تثلیث کی حکومت تھی۔ تکبیر کی صدا خاموش ہو چکی تھی۔ اقبال تہذیب اسلام کے اِس گورستان کو دیکھکر ہجوم غم سے بے قرار ہو گیا آپ کی نظم "صقلیہ جزیرہ سسلی" ہی نہیں بلکہ مغرب بھر میں تہذیب حجازی کی موت کا مرثیہ سمجھنا چاہیئے۔ اس نظم میں ایک مقام پر فرمایا ہے۔

نالہ کش شیراز کا بُلبُل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبالؔ کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

اسی نظم میں فرمایا ہے

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤنگا

"بلاد اسلامیہ" میں بھی مسلمانوں کی کئی مٹی ہوئی بستیوں کو یاد کرکے آنسو بہائے ہیں ڈاکٹر اقبال کے جذبات ملت میں اشتعال پیدا کرنے کا دوسرا بڑا باعث اُس زمانہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی تھی۔ مسلمان ہندوستان کے اندر اور باہر ہر جگہ اور ہر ملک میں ذلیل ہو رہے تھے۔ جنگ بلقان اور طرابلس الغرب کی لڑائیوں میں خون مسلم پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ قسطنطنیہ میں خلافت کا مریض آخری سانس لے رہا تھا۔ الغرض اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے والا تھا۔ اس لئے ہمارے قومی شاعر کا دل غم و الم کی آماجگاہ تھا۔

انہی جذبات غم نے اِس مجتہد شاعر کے فکر کو جلا دی اور اُس نے اسلام کے ماضی کے تذکروں اور حال کی تصویروں میں اپنے دونوں سوالات کا جواب پا لیا۔ نوائے سروش نے اس قومی ریفامر کو سنا دیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت اس وجہ سے تھی کہ ان میں اخوت تھی مساوات تھی خلوص تھا جذبہ ایثار تھا۔ خود داری تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ انھیں خدا تعالےٰ پر ایمان کامل تھا۔ وہ تعلیم اسلام کے حامل بھی تھے اور عامل بھی۔ یہ اوصاف تھے جن کی بدولت وہ ان اشعار کا مصداق بنے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ‏ خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں ‏ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی ‏ کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

اور پھر۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے ‏ بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے اسلاف کے اوصاف سے عاری ہیں تعلیم اسلام سے بیگانہ ... ہیں۔ اخوت و مساوات ذاتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئی ہے اِن کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود ‏ یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو ‏ تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اِن میں اتحاد کا کہیں دور دور بھی پتہ نہیں ملتا۔ عفو و خطا پوشی کا کہیں نام نہیں۔ اِس مضمون کی ضمن میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ان کے اسلاف کے ساتھ مقابلہ کیا ہے فرماتے ہیں

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم ‏ تم خطا کار و خطا بیں وہ خطا پوش و کریم
خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خود دار ‏ تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پر نثار

اس مضمون کو کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان دنیا میں اس وجہ سے معزز و مکرم تھے کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان تھے اور موجودہ مسلمان اِسلئے ذلیل ہیں کہ وہ تعلیم قرآن کو فراموش کر چکے ہیں۔ یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر ‏ اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وہ افسوس کرتے ہیں کہ مسلمان قوم اپنا وقار کھو دینے کے بعد احساسِ زیاں تک نہیں کر سکتی،

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ‏ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

الغرض اقبال قومی پستی کے اسباب و وجوہ سے آگاہ ہو کر قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتے ہیں چنانچہ اس کے بعد کے کلام کا اکثر و بیشتر حصہ اسی مشن "اصلاحِ قوم" سے متعلق ہے۔ شکوہ جواب شکوہ

خضرِ راہ۔ طلوعِ اسلام۔ ترانۂ ملّی۔ خطاب بہ نوجوانانِ اسلام۔ مسلم وغیرہ ان کی معرکتہ الآرا قومی نظمیں ہیں ان کا ہر ہر شعر دردِ قومی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہر لفظ میں صورِ اسرافیل کی سی گونج ہے جو غفلت کے مارے مسلمانوں کے مردہ جذبات کو پیغامِ حیات دیتی ہے۔

اُن کا تخیّل پیغامِ سروش ہے۔ اندازِ بیان اعجاز ہے جو ان کے کلام کو پڑھنے یا سننے والوں کے دلوں میں اُتر کر انھیں منقلب کر دیتا ہے۔

"خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں فرماتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

بہت سی خوبیاں کرنے کے بعد فرماتے ہیں

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

کون جوان مسلم ہے جو اس نظم کو پڑھے اور اس کے دل میں اپنے اسلاف کی سی جہاں گیری جہانداری جہانبانی اور جہاں آرائی کی خواہش پیدا نہ ہو۔

الغرض اقبال اپنی قوم کے مردہ جذبات کو زندہ کرنے کے لئے انھیں درس دیتے ہیں۔ اُمید کا خودی کا۔ ملّت پرستی کا۔ تعلیم اسلام پر عمل کرنے کا۔ ایثار کا۔ اتحاد کا۔ کیونکہ انہی اوصاف کی بدولت اُن کے اسلاف فاتحِ عالم بنے تھے اور انہی سے عاری ہو کر موجودہ مسلمان رسوائے عالم ہیں۔ وہ پُر اُمید شاعر ہیں اپنی قوم کو پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمانو تمہاری موجودہ پست حالی تمہیں مایوس نہ کر دے مسلمانوں کو یاس سے کچھ مناسبت نہیں۔ وہاں تو لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ تم لاعلاج نہیں ہو۔ اُٹھو ہمت کرو اور اس ادبار کی ذلّت کو مٹا دو۔ اگر تعلیم اسلام کے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کر لو تو اب بھی دنیا میں سرفراز ہو سکتے ہو۔

بخواں از بر صداقت را۔ عدالت را شجاعت را
کہ عالم باز میگیرد ز تو کارِ امامت را

تم اب بھی وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ کے وعدہ کے مطابق دنیا کے حکمران ہو سکتے ہیں۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ کے ارشاد کے بموجب اب بھی سرفراز ہو سکتے ہو مگر شرط یہ ہے کہ سچے مسلمان بنو

اور بہت سی خامیوں کے علاوہ جس چیز نے مسلمانوں کے جذبۂ عمل کو مردہ کر کے ان پر سکوت و جمود کی حالت طاری کی ہے۔ وہ ہمارے صوفی حضرات کا مسئلہ جہاد بالنفس ہے جس میں وہ خودی کو مٹانے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی پر ضرورت سے زیادہ زور دیکر دنیاوی اعزاز و اکرام کو نگاہوں میں ہیچ کر دیتے ہیں۔ پھر جب کسی چیز کی وقعت ہی دل میں نہ رہی تو اُسے حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو تو کیونکر۔ اور جب تمنا ہی نہ ہو۔ خواہشات ہی مردہ ہو جائیں تو جد وجہد کی جائے تو کس چیز کے لئے؟ حضرت اقبال نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا کہ جہاد بالنفس کی تلقین نے قوم کے ذہنی۔ جسمانی اور روحانی قوا کو ناتواں کیا ہے۔ بے جا عجز و خاکساری نے خودی و خودداری کو فنا کیا ہے۔ اور توکل و قناعت کی صوفیانہ تاویلوں نے تگ و دو کے میدان کو بالکل ہی مسدود کر دیا ہے۔ الغرض اس صوفیانہ تعلیم نے مسلمان قوم کے جذبۂ عمل کو پامال کرنے کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ اسلام کی تعلیم تو فکر و عمل جد وجہد۔ اخلاقی قوت۔ جوش و سرگرمی ہے اور ہماری قوم بہ حیثیت قوم اِن اوصاف سے عاری ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ خواہ صوفیانہ تعلیم تھی یا مسلمانوں کی اپنی عافیت کوشی و عیش پرستی۔ بہر حال ہمارے مصلح شاعر نے محسوس کیا کہ احیائے ملّت کے لئے جذبۂ عمل کا احیا ضروری ہے اور وہ اس وقت تک پیدا نہ ہو گا جب تک قوم اپنی حقیقت کو پہچان کر احساسِ زیاں نہ کرے گی۔ لہذا انھوں نے قوم کو پیغام خودی دیا تاکہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں۔ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ مسلمان کا مقام پستی نہیں وہ تو عرش بریں سے بھی بلند رتبہ ہے مسلمان کس قدر رفیع القدر ہے وہ اِن الفاظ میں بتاتے ہیں۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر ‏ ‏ ‏ نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا ‏ ‏ ‏ کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

اپنی حقیقت اپنی قدر و منزلت پہچاننے کے بعد ضروری ہے کہ قوم کو اُس کی پست حالی کا احساس ہو۔ چنانچہ اِس فطرت شناس مصلح نے محسوس کیا کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو کر رہے ہیں۔ اُن میں صدیوں کے مردہ جذبات ملی حیاتِ تازہ پا رہے ہیں۔ تو ضروری ہوا کہ اِن جذبات کو برسر کار لانے کے لئے قوم کے دل میں شوکت رفتہ کو حاصل کرنے کی آرزو پیدا کی جائے۔ چنانچہ اقبال نے مسئلہ آرزو پر بحث کرتے ہوئے مختلف طریقوں سے اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است، ‏ ‏ ‏ اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار، ‏ ‏ ‏ تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست ‏ ‏ ‏ فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقص دل در سینہ ہا ‏ ‏ ‏ سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را ‏ ‏ ‏ خضر باشد موسئ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات ‏ ‏ ‏ غیر حق میرد چو او گیرد حیات

الغرض درس خودی میں اقبال نے پیغام حیات دیا۔ تلقین صوفیا کے مطابق تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا ناپائدار ہے اس سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ لیکن اقبال فرماتے ہیں مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کے ارشاد کے ماتحت دنیا اور حیات دنیا بے حقیقت اور فضول نہیں بلکہ تخلیق ہستی کے مقاصد نہایت ہی بلند واقع ہوئے ہیں۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار ‏ ‏ ‏ اور اِس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں ہزار

وہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا فانی ہے تو ہوا کرے انسان کو اپنی جدوجہد سے سعی و عمل سے اس فنا کو بقا میں تبدیل کرنا چاہئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

الغرض اقبال نے قوم کو فلسفۂ خودی میں یہ سبق سکھایا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانیں اپنے روحانی وجسمانی ارتقا کے لئے تمام فطری قوتوں کو سرگرم عمل رکھیں۔ مقصد حیات کے حصول کی جدوجہد کو کبھی بند نہ کریں۔

اقبال اسی ضمن میں قوم کو خودداری کا سبق سکھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی حقیقت کو پہچان کر ایسی روحانی ونفسیاتی قوت پیدا کریں جو اُنھیں بغیر کسی دوسرے کی اعانت کے عروج و کمال تک پہنچاوے۔ کیونکہ مسلمان کی غیرت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کی ضرورت سے بے نیاز ہو۔ مسلم فطرتاً حُر ہے اُسے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تا توانی کیمیا شو گل مشو درجہاں منعم شو سائل مشو

پھر فرمایا ہے۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

ایک جگہ تلقین فرمائی ہے۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست مور بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

پیام اُمید اور درس خودی کے بعد وہ جس چیز کو احیائے ملّت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں وہ اجتماعیت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو جو چیز قدم قدم پر فتح و نصرت دیتی تھی۔ وہ اُنکی اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ جمعیت قومی تھی۔ اُنھوں نے اپنی انفرادیت کو قومیت میں جذب کر دیا تھا۔ ہر مسلمان کا نصب العین ایک اور مقصود واحد ہوتا تھا۔ چنانچہ اُن کی متحدہ طاقت کا سمندر جوش وخروش کی ہنگامہ خیزی کے وقت اپنے سامنے کی ہر بڑی سے بڑی چیز کو بہالے جاتا اور خود کردۂ عالم کی سمتوں میں جس طرف چاہتا راہ بناتا ہوا چلا جاتا۔ لیکن آج کے مسلمانوں میں قوت کا فقدان اِس وجہ سے

ہے کہ ان کی طاقت جغرافیائی حدود۔ رنگ ونسل کے امتیازات اور عقیدہ کے فروعی اختلافات میں منقسم ہے۔ اقبال ان چیزوں کو مٹا کر بھرے جماعتی زندگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائیگا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی — اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگزار

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہوجا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ڈاکٹر اقبال کی اس تعلیم کو بعض اصحاب پین اسلامزم کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن یہ پین اسلامزم عین اسلام ہے۔ اخوت۔ مساوات۔ جماعتی زندگی یہ سیاسی ومعاشرتی اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ ہماری روایات ماضی اس پر شاہد عادل ہیں۔ اقبال کا فلسفہ واجتماع کوئی نئی اور الگ چیز نہیں بلکہ فلسفہء اسلام کی ایک شق ہے وہ اس میں مسلمانوں کو واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ آج مسلمانوں کی کتنی قسمیں ہیں۔ عربی، ایرانی۔ مصری۔ ہندی وغیرہ وغیرہ اور پھر سید، افغان، مرزا صاحبان اور اس کے بعد شیعہ سنی وہابی احمدی وغیرہ وغیرہ اصحاب۔ الغرض مسلمانوں کو اس تقسیم در تقسیم نے بے حد کمزور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک مصلح کی حیثیت سے محسوس کیا کہ اس قومی ناتوانی کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان ٹکڑوں کو یکجا کرکے جوڑا نہ جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا

پھر فرمایا ہے اور بجا فرمایا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پھر فرماتے ہیں۔

آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی　　　　جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

ان چیزوں نے علاوہ مسلمانوں کی کمزوری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کا ایمانِ مسلمانانِ سلف کا سا پختہ نہیں۔ ہمارے اسلاف ماسوا اللہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اُن میں ایمان کی طاقت تھی۔ وہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرتے نہ تھے۔ لیکن آج کے مسلمانوں کو قدم قدم پہ دنیاوی خداؤں کا خوف ہے۔ ایمان کی اس کمزوری نے اُنھیں بزدل بنا دیا ہے اگر اپنے اسلاف کی طرح ان کو خدا تعالیٰ پر پختہ یقین و ایمان ہو جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ان کے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ یقین ایک ایسی طاقت ہے جو اُن کے قلوب سے ماسوائے اللہ کے خوف کو نکال کر اب بھی اُن کی بگڑی تقدیر کو بنا سکتی ہے۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے　　　　یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیرِ ملّت ہے

پھر فرمایا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا　　　　تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ایک جگہ اِس مضمون کو کہ ایمان کی طاقت سے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ یوں باندھا ہے۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

الغرض اُنھوں نے مسلمان قوم کی تمام بیماریوں کا علاج تعلیمِ اسلام پر عمل تجویز فرمایا ہے اُن کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان اپنے اسلاف کے اوصاف کو اپنے میں پیدا کریں اخوت، مساوات، جمعیت، عدل، شجاعت، جذبۂ عمل، خدا تعالےٰ پر ایمان کامل یہ چیزیں ہیں جو اُن کے شاندار ماضی کو حال میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ وہ اہلِ ہند کو تہذیبِ مغرب کی خامیوں سے آگاہ کر کے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ تہذیبِ اسلام میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔

انسانیت کے مدارج عالیہ اور اسکے نمونے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظر میں

(تجمل حسین صاحب لکچرار ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

دور حاضرہ میں انسانیت کی عظمت کے علمبردار ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اسرار خودی کو جتاکر جہاں انسانی زندگی کے وقار کو آشکار کیا ہے وہاں ایسی ہستیوں کو بھی پیش کیا ہے جن کی زندگیاں انسانی "انا" کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ خودی کی استواری کو جہاں زندگی کی قوت اور بلندی کا معیار قرار دیا ہے وہاں ایسی ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اعمال و کردار نے انسانی خودی کی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔ عشق اور محبت کو جہاں خودی کے استحکام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے وہاں ایسی ذوات مقدسہ سے بھی ہمیں روشناس کرایا ہے جن کی محبت ہماری خودی کے استحکام کا باعث ہو سکتی ہے اور جن کی تاسی سے انسانی "انا" تربیت پاکر ارتقا کے مدارج عالیہ پر فائز ہو سکتی ہے۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار — تا کمند تو شود یزداں شکار
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق — جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق،
تا خدا اے کعبہ بنوازد ترا — شرح انی جاعلٌ سازد ترا

نوع انسانی کی عظمت کا تخئیل اس سے بلند تر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جوہر نوری جو ہم میں ہے۔ جسے انا۔ خودی یا "میں" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ایسی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ مدارج عالیہ طے کرکے نیابت الٰہی کے درجہ پر فائز ہو سکتا ہے اور حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق بن سکتا ہے اب نائب الٰہی کی شان اور عظمت ملاحظہ فرمائیے۔ انسانی مدارج کمال کی بلندی کا اندازہ لگائیے۔

نائب حق ہم چو جانِ عالم است — ہستی لفظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگاہ بود — در جہاں قائم با مر اللہ بود
نغمہ زا تار دل از مضراب او — بہر حق بیداری او خواب او

ازقمِ او خیزد اندر گورِ تن | مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن
زندگی بخشد ز اعجازِ عمل | می کند تجدید اندازِ عمل

لیکن نیابت الٰہی کے عالی درجہ اور عظیم الشان مرتبہ پر پہنچنے کے لئے کچھ مرحلے ہیں جو طے کرنے ہوتے ہیں ان میں پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار | می شود از جبر پیدا اختیار
ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند | خویش را زنجیریِ آئیں کند
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی | تو چرا غافل ازیں ساماں روی
عاشقی۔ محکم شو از تقلیدِ یار | تا کمندِ تو شود یزداں شکار
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا | شرحِ انی جاعلٌ سازد ترا

اس طرح پابندیٔ آئین کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری بتایا ہے لیکن وہ کونسا آئین ہے جس کی پابندی ان مدارجِ عالیہ پر پہنچنے کے لئے لازمی ہے۔ اس کے لئے بھی ڈاکٹر صاحب کا ارشاد سنئے۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو | از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرد
باز اے آزادِ دستورِ قدیم | زینت پا کن ہماں زنجیرِ سیم

لیکن آئینِ مصطفوی میں وہ کیا خصوصیت ہے کہ نوعِ انسانی کے لئے ان ہی آئین کی پابندی باعث شرف و افتخار ہے اس سوال کا جواب بھی ڈاکٹر صاحب کے کلام سے ملیگا اور وہ یہ ہے:۔

بود انساں در جہاں انساں پرست | ناکس و نابود۔ مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش | بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر | بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت | باج بر کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش | بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرت او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینے حق بحق داراں سپرد — بندگاں را مسند خاقاں سپرد
حریت زاد از ضمیر پاک او — ایں مئے نوشین چکید از تاک او
کل مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ

آئین مصطفوی کی پابندی اسلئے نوع انسانی کے لئے باعث شرف ہے کہ یہی ایک آئین ہے جو فرد انسانی کے برابری کے حقوق کی ضمانت کرتا ہے۔ عالم گیر برادری قایم کرتا ہے۔ اور ہر فرد کے لئے پوری آزادی کی فضا پیدا کرتا ہے غلامی کی زندگی خودی کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ آئین مصطفوی مساوات۔ اخوت اور حریت کی بنیاد ڈالتا ہے اور اسی لئے بنی نوع انسان کے لئے بزرگی اور شرف کی راہیں کھولتا ہے

خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں

اب ضبط نفس کے ذرائع سنئے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد، — فارغ از بند زن و اولاد شد
لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز — قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است — قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند — خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج — ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایہ جمعیتے، — ربط اوراق کتاب ملتے

حب دولت را فنا ساز د زکوٰۃ — ہم مساوات آشنا ساز د زکوٰۃ

ایں ہمہ اسباب استحکام تست — پختۂ محکم اگر اسلام تست

اہل قوت شو ز وردِ یا قوی

تا سوار اُشتر خاکی شوی

یہ ہیں مراحل جو خودی کی تربیت کے لئے ضروری ہیں اور جن کے طے کرنے پر نیابت الٰہی کا حصول ممکن ہے۔ اب ان ذوات مقدسہ کا ذکر سنئے جنھوں نے آئین مصطفوی کی متابعت میں ان مدارج عالیہ کو طے کیا ہے اور جن کی زندگیاں مسلمانوں کے لئے کیا تمام بنی نوع انساں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ نیابت الٰہی کے مدارج بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال حضرت علیؓ کے اسمائے کے اسرار اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

مسلم اول شہ مرداں علیؓ — عشق را سرمایہ ایماں علیؓ

از رخ او فال پیغمبر گرفت — ملّتِ حق از شکوہش فر گرفت

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب — حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

خاک تاریکے کہ نام او تن است — عقل از بیداد او در شیون است

شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد — ایں گل تاریک را اکسیر کرد

زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است — دست او آنجا قسیم کوثر است

ذات او دروازہ شہر علوم — زیر فرمانش حجاز و چین و روم

حضرت علیؓ کی عظمت و شان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب بنی نوع انسان کی بزرگی کا راستہ ان کی پیروی میں بتلاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

مرد کشور گیر از کراری است — گوہرش را آبرو خودداری است

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب

ہر کہ زیں بر مرکب تن تنگ بست | چوں نگیں بر خاتم دولت نشست
حکمراں باید شدن بر خاک خویش | تا مے روشن خوری از تاک خویش
از گل خود آدمے تعمیر کن | آدمے را عالمے تعمیر کن
در عمل پوشیدہ مضمون حیات | لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہاں تازہ شو | شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
ممکنات قوت مردان کار | گردد از مشکل پسندی آشکار

عورتوں کے لئے حضرت علیؓ کی مردانہ زندگی اسوہ کاملہ نہیں ہوسکتی اسلئے عورتوں کے لئے حضرت فاطمہ زہرا کی زندگی کو اسوہ کاملہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

(۱) مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز | از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمۃ اللعالمین | آں امام اولین و آخریں
آں کہ جان در پیکر گیتی دمید | روزگار تازہ آئین آفرید
(۲) بانوے آں تاجدار ہل اتیٰ | مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوان او | یک حسام و یک زرہ سامان او
(۳) مادر آں مرکز پرکار عشق | مادر آں کارواں سالار عشق
آں یکے شمع شبستان حرم | حافظ جمعیت خیر الامم
تا نشیند آتش پیکار و کیں | پشت پا زد بر سر تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرار جہاں | قوت بازوئے احرار جہاں
نوری و ہم آتشی فرمانبرش | گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا | آسیا گرداں و لب قرآں سرا
اشک او برچید جبریل از زمیں | ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں

رشتہ آئینِ حق زنجیر پاست — پاس فرمان جناب مصطفےٰ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے — سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اور چونکہ

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماس و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

اور پھر چونکہ اس دولت کا کھوٹا اور کھرا ہونا ماؤں پر منحصر ہے:۔

سرت فرزند ہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات

اسلئے ماؤں کے لئے اسوۂ کاملہ کے طور پر حضرت فاطمہ زہرا کو پیش کیا ہے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول — مادراں را اسوہ کامل بتول

حضرت فاطمہ زہرا کی زندگی کا عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ ہونے کی حیثیت اس سے اور بلند ہو جاتی ہے کہ اس مخدومۂ عالم کے دونوں فرزندوں کی زندگیاں قوم و ملت کی بقا کے لئے ہدایت کے روشن ستارے ہیں جو اپنی روشنی سے اب بھی ملت کے لئے رہنمائی کا باعث ہیں حضرت امام حسن رضؓ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ملت اور قوم کے اتحاد اور جمعیت کے لئے سرداری اور ظاہری وجاہت حتیٰ کہ نگین حکومت سے بھی دستکش ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ ملت کی شیرازہ بندی منتشر ہو جائے اور آپس میں کشت و خون کا بازار گرم ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

آں یکے شمع شبستانِ حرم — حافظ جمعیت خیر الامم
تا نشیند آتش پیکار و کیں — پشت پا زد بر سر تاج و نگیں

حضرت امام حسین رضؓ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ملت کا قائد یا نام نہاد خلیفہ آئین مصطفوی سے اپنا رشتہ توڑ دیتا ہے تو سچے مسلمان کا سر اس کی اطاعت سے اپنے کو پابند نہیں کرتا۔ چنانچہ امام حسین رضؓ کی شان میں فرماتے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتول — سرو آزادے ز بستانِ رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوش ختم المرسلین نعم الجمل
درمیان امت آں کیواں جناب — ہمچو حرف قل ہو اللہ در کتاب
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
سرِ ابراہیم و اسماعیل بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود
عزم او چوں کوہساراں استوار — پایدار و تند سیر و کامگار
تیغ بہر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں — اشک ما بر خاک پاک او رساں

رسول اکرم کی محبت اور انکی پیروی ہماری دنیوی اور آخری نجات کا باعث ہو اور ان حضرات کو بھی ہم رسول اکرم کیساتھ لفظ پنج تن پاک سے یاد کرتے ہیں انکی پیروی بھی ہمارے لئے ویسے ہی دنیوی اور آخری نجات کا باعث ہو کیوں نہ ہو۔ یہی حضرات ہیں جنھوں نے رسول اکرم کی پاک صحبت میں پرورش پائی تھی جوان کی گود میں پلے تھے۔ جنھوں نے براہ راست ہمارے رسول سے تعلیم پائی تھی جن کی رگوں میں ہمارے رسول کا خون تھا جو ان صورت اور سیرت پر پلے بڑھے تھے اور جو رسول اکرم کے بعد ان کے اسوہ کاملہ کی دلیل

ہدایت ہیں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

از دلائے دو د مانش زندہ ام　　　　در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

اقبال

(محمد رضا علی خاں صاحب ایم۔اے۔ال ال بی (علیگ) ایڈووکیٹ ہائی کورٹ جے پور)

صدر محترم و حضرات

اخبارات میں اقبال ڈے کے متعلق اعلانات اور لاہور و دہلی جیسے مرکزی مقامات پر اس روز کی تیاریوں کے حالات نظر سے گذر رہے تھے۔ مگر لٹریری کارپوریشن کے ارکان کی سرگرم کوششوں اور ادب دوست حضرات کی ہمت افزائی سے یہاں بھی یہ مجلس آراستہ ہوئی۔ ہمیں مسرت ہے کہ جے پور بھی آج اس تقریب سعید میں شامل ہے۔

بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ارکان لٹریری کارپوریشن کا شکریہ ادا کیا جائے۔ مگر علمی خدمت کرنیوالے ان رسمیات سے بالاتر ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں چاہتا کہ ان تکلفات میں الجھ کر انہیں تکلیف پہنچاؤں۔ مجھے اس موقعہ پر کچھ عرض کرنے کی فرمایش کی گئی تھی۔ میں نے معذرت طلب کی۔ مگر ایک پیش نہ گئی۔ اور مجھ جیسے عزلت نشین کو آپ کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ بہر حال تعمیل حکم ضروری ہے۔

جس تقریب میں ہم آپ سب جمع ہوئے ہیں وہ اقبال ڈے ہے جس کے منانے کی ایک صورت تو یہی ہے کہ سب تھوڑی دیر کے لئے جمع ہوئے۔ تھوڑی بہت گفت و شنید کی اور اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ لوگ زیادہ جمع ہوئے اور محفل گرم ہوئی تو کہا کہ اقبال ڈے کامیاب ہوا۔ "اور بالخیر و شما بسلامت" کہہ کر روزانہ کی یکسو و یکساں (سپاٹ) زندگی میں محو ہو گئے۔

حضرات زندہ قومیں اپنے مشاہیر کے پیغام کی تبلیغ و اشاعت جس پیمانہ پر کرتی ہیں اس کی تفصیل کا

یہاں نہ موقع ہے نہ وقت، بادی النظر میں یہ ایک غیر ضروری ہنگامہ معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر اس قسم کی تقریبات ملک وقوم کی یکساں اور افسردہ زندگی میں حیات تازہ کی پیغامبر ہوتی ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ سے یہ نہ کہوں گا۔ کہ آپ روزانہ اقبال ڈے منایا کریں۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ اقبال جیسے زبردست بین الاقوامی شہرت کے شاعر اور بلند پایہ مفکّر کے پیغام کو زیادہ نہیں۔ کبھی فرصت کے لمحات میں غور سے مطالعہ کریں۔

اقبال ڈے "انٹر کالج مسلم برادر ہڈ" لاہور کی تحریک پر ملک کے طول وعرض میں منایا جا رہا ہے۔ نوجوانان ملک کی یہ تحریک قابل صد ستایش ہے۔ میں نے بھی اس موقعہ پر یہ مناسب سمجھا۔ کہ اقبال نے جو پیغام نوجوانانِ ملک وقوم کے نام بالواسطہ یا بلاواسطہ دیا ہے۔ آج کی صحبت میں اس کے متعلق کچھ عرض کروں۔ ویسے بھی اقبال کے مخاطب صحیح نہ بچے ہیں نہ بوڑھے بلکہ اُس کے مخاطب صحیح نوجوانانِ ملک وقوم ہیں جن کے دامن سے ملک کی فلاح وابستہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا دور جیسا کہ ظاہر ہے اس صدی کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ اور جس طرح بتدریج حوادث و واقعات نئی نئی تحریکیں وقوع پذیر ہوئیں اقبال کو بھی اس خاص زمانہ کی رہنمائی کے لئے بصیرت ملتی رہی۔ شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء میں ختم ہوتا ہے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ان کے قیام یورپ کا زمانہ ہے۔ یہ اون کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۴ء پر ختم ہوتا ہے۔ چوتھا دور ۱۹۲۴ء سے شروع ہوا ہے۔ اور بالِ جبریل اور ضربِ کلیم اس پر آشوب دور میں ہمیں نشان راہ بتاتی ہیں۔

حضرات۔ قوموں اور ملکوں کی زندگی میں جوانوں کو جو مرتبہ حاصل ہے اُس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ جوانوں سے میری مراد وہ ہیں کہ جو ابھی علم وہنر کی صبر آزما منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں کہ جو اس کشاکش حیات میں شامل ہو چکے ہیں۔ مگر جن کی زندگی کا آفتاب ابھی نصف النہار پر ہے۔ اس صدی کے آغاز پر یعنی آج سے چالیس سال قبل ہم نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ زمانہ مقابلتہً بہت عافیت کا تھا۔ نہ یہ امن سوز تحریکیں تھیں اور نہ لذت پرستی و بے کاری کا زور تھا۔

اقبال کے دور اول کی شاعری اگرچہ مناظر قدرت کی مصوری ہے۔ مگر ان کی دور رس نگاہوں سے آنے والے واقعات مخفی نہیں ہیں۔

زیادہ وضاحت کے لئے عرض کروں گا۔ کہ اون کی شاعری ورڈس ورتھ (Words worth) کی شاعری ہے۔ قدرتی مناظر کو جس شگفتہ زبان میں ادا کیا ہے۔ ادنہیں کا حصہ ہے۔ کہیں "ہمالیہ" سے خطاب ہے۔ کہیں "گلِ رنگیں" سے اس طرح ہم کلام ہیں۔

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا   دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ تیرا

کبھی "ابر کہسار" کی زبان سے یوں گہر بار ہیں۔

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں   کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں   بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعۂ نوخیز کی امید ہوں میں   زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں
چشمۂ کوہ کو دی شورش قلزم میں نے   اور پرندوں کو کیا محو ترنم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے   غنچۂ گل کو دیا ذوق تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے   جھونپڑے دامن کوہسار میں دہقانوں کے

"آفتاب" "ایک آرزو" اسی رنگ میں بہت کامیاب اور بے مثل نظمیں ہیں۔ یہ مناظرِ فطرت کی مصوری کا دور ہے۔ کہیں کہیں اقبال بچوں سے گویا ہیں۔ اور بہت سی مفید باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ نظمیں بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن میں بچوں کو لطف اور دلچسپ قصوں کے پیرایہ میں اخلاقی سبق ذہن نشین کراتے ہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے   آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں   کوئی برا نہیں ہے قدرت کے کارخانے میں

ورڈس ورتھ (Words worth) کے خیال کے موافق اقبال بھی طفل شیر خوار کو تجلّیات الٰہی کا حامل سمجھتے ہیں۔ اور اس نو وارد اقلیم غم کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

(ode to immortality) میں جو ورڈس ورتھ (Wordsworth) نے کہا تھا۔ وہ اقبال نظم "بچہ و شمع" میں کہہ اُٹھتے ہیں۔

اس نظارہ سے تیرا ننّھا سا دل حیران ہے یا کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے
شمع ایک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے آہ اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا

ابھی میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ دورِ اوّل کے ابتدائی حصّے میں دل چسپ قصّوں کے پیرایہ میں اخلاقی سبق بچوں کے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ مگر وہ بچے اب بڑے ہو چکے ہیں۔ استطاعت اور صلاحیت کے حامل ہیں۔ شاعر بھی ساتھ ساتھ اسی دور کے آخر حصّے میں انداز بیان بدل دیتا ہے۔ "تصویر درد"۔ "نالہ فراق" "قومی گیت" "التجائے مسافر" اسی دور کی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ غزلیں ہیں جن میں نوجوانوں کے لئے بہت سے جواہر ریزے ملتے ہیں۔ کہیں طلب علم کی تکرار ہے۔ کہیں ذوقِ عمل پر اصرار ہے۔ کہیں اخلاقیات کا درس ہے۔ کلام کا دوسرا دور زیادہ تر قیام یورپ کے زمانہ کا ہے۔ یہ زمانہ اقبال کے لئے سخت امتحان کا دور ہے۔ مگر وہ اس آزمایش میں پورے اُترتے ہیں۔ اپنی تہذیب پر قایم ہیں۔ مگر عصبیت سے دور ہیں۔ شراب علم کی لذّت سے پورے طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ مگر لگاؤ خانۂ وطن سے اور زیادہ جذب بڑھ جاتا ہے۔ یہ وطن کی تہذیب اور روایات سے بیزار نوجوانوں کے لئے بہت غور کا مقام ہے اس دور میں اقبال ایک پیغام گو ہیں۔ "طلبا علی گڑھ کالج کے نام" سے ابتدا ہوتی ہے۔ نوجوانوں کو پیغام دیتے ہیں "پیام عشق" اور "عبدالقادر کے نام" اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان دونوں مشہور نظموں کا ایک ایک شعر عمل کا پیغام ہے۔

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق   سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دیکر   قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ دور یورپ سے واپسی کے بعد شروع ہوا۔ ایک طرف اُنھوں نے اقوام یورپ کی بیداری سرگرمیٔ عمل علمی تحقیقات اور اُن کے نتائج کا غائر مطالعہ کیا دوسری طرف اہلِ وطن کی یہ حالت ہے۔ کہ عمل و تحقیقات سے دور ہیں۔ لذت پرستی کا زور ہے تقلید ذہنی غلامی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہی وہ زمانہ بھی ہے۔ جبکہ نہ صرف اون کے اہلِ وطن بلکہ اہلِ قوم بھی حوادث کا نشانہ بن چکے ہیں۔ نوجوانوں پر جمود و بے حسی طاری ہے۔ اقبال نے اون کو ڈھارس بندھائی۔ احساس زیان سے واقف کیا۔ اسلاف کے کارنامے سنائے۔ اور غیرت دلائی۔ ناامیدی کو امید سے بدلا۔ "جواب شکوہ" میں اسلاف کے کارنامے محفوظ ہیں۔ "خطاب با جوانان اسلام" "غرہ شوال یا ہلالِ عید میں" انھوں نے دل سوزی کی ہے۔ اور دلوں کو تڑپایا ہے۔ "مسلم" "نوید صبح" "شعاعِ آفتاب" میں امید بندھائی ہے۔ "مسلمان اور تعلیم جدید" "مذہب" کے ذیل میں خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ "طلوعِ اسلام" میں امید کا پیام دیا ہے۔ "خضر راہ" میں دنیا کے اہم مسائل کو پیش کیا ہے۔ انہیں مسائل پر دور چہارم میں "بالِ جبریل" و ضربِ کلیم میں مکمل روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کو وضاحت سے حل کیا ہے۔ بالِ جبریل و ضربِ کلیم میں زیادہ حصہ نوجوانوں کو پیغام پر وقف ہے۔ اقبال نے ان دونوں میں نوجوانوں کی ہر شعبۂ حیات میں رہنمائی کی ہے۔ تہذیب حاضر کے خطرات سے متنبہ کیا ہے۔ بالِ جبریل میں "ذوق و شوق" "جاوید کے نام" "ایک نوجوان کے نام" "پیر و مرید" ان تمام نظموں میں عزم و عمل کے مجسمے جوانانِ ملک کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ضربِ کلیم میں نوجوانوں کے متعلق وہ سب کچھ ہے جس کی اس ہنگامہ خیز زندگی میں ضرورت ہے۔ "تعلیم و تربیت" "مغربی تہذیب" "آزادیٔ فکر" "طالب علم" "دین و تعلیم" "جاوید سے" "آزادیٔ نسواں" میں محض دعوتِ فکر ہی نہیں دی ہے بلکہ نوجوانانِ ملک کے لئے ایک مستقل شاہراہ قائم کی ہے۔

اسی دور کے عمرانی اور سیاسی مسائل سے بھی نوجوانوں کو آگاہ کیا ہے۔ اور اُن کے مختلف

پہلوؤں کو اُجاگر کر کے آخری فیصلہ دیا ہے۔

اقبال کی شاعری کا مقصد گرمی محفل نہیں۔ اس نے نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ فلسفہ اور حکمت کی رگ وپے سے واقف ہے۔ دنیا کے حالات و تحریکات قوموں کے نشیب و فراز ان سب پر اوس کو بہت گہرا عبور ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ مستقبل کے واقعات اس طرح کہہ جاتا ہے گویا سب ہمارے سامنے گذر رہے ہیں خود کہتا ہے۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

دوسری جگہہ بھی اسی کی تکرار ہے۔

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانہ کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

ماں کی آغوش بچوں کا سب سے بڑا اور پہلا مکتب ہے۔ ہمارے بچوں کی جیسی ناقص ناگفتہ بہ ماحول میں نشوونما ہوتی ہے۔ اُس کی تفصیل طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں۔

اقبال آج کے بچوں اور کل کے نوجوانوں کے دل میں جن بلند عزایم اور اعلیٰ خیالات کی روح پھونکتا ہے وہ بچہ کی دعائیں شاعرِ مشرق کے لب اعجاز سے سُن لیجئے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دُنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو میری پروانہ کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

کیا کوئی اس سے بلند اور پاکیزہ زندگی کا نصب العین پیش کر سکتا ہے۔

حضرات ملک و قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز وحدت مقصد کا وجود ہے یہی وہ مرکزی

نقطہ ہے۔ جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں۔ حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر واعظ اپنے ممبر پر۔ سپاہی اپنے میدان میں اہل پیشہ اپنے بازار میں۔ عالم اپنی درس گاہ میں۔ صناع اپنی کارگاہ میں۔ اخبار نویس اپنے دفتر میں۔ یہاں تک کہ اوس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اخلاق اور کیریکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم و ملک کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ بہت کچھ اسی مقصد عزیز کی گراں تھا متاع کی حفاظت ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار۔ قربانی۔ عزم واستقلال۔ فیاضی جوانمردی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر نوجوانوں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

وحدت مقاصد اور وحدت کردار لازم و ملزوم ہیں جو کہ نوجوانوں کی جدوجہد کے بغیر کوئی مستقل صورت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس بار گراں کے امانت دار نوجوان ہیں۔ آیئے اقبال سے سنئے کہ احساس فرض کی شاہراہ پر ڈالنے کے لئے نوجوانوں کو کس طرح تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ اقبال نے نوجوانوں کے اخلاق کی تعمیر پر بہت زور دیا ہے۔ اخلاق کی تعلیم اوس کے نزدیک ازحد اہم و ضروری ہے۔ پیام مشرق کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھتا ہے "اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنی جوانی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی۔ جب تک کہ پہلے اوس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اوس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ اخلاقی تعلیم میں نوجوانوں کو سب سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلہ کی قوت ہے مستحکم عزم پیدا کرنا اور اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دینا اور اُس کو کامیابی تک پہونچانا ہے۔ خود اعتمادی وہ مرکزی نکتہ ہے جس کے بلند حوصلگی۔ جستجو۔ تلاش ذوق عمل۔ طلب علم۔ حلقے ہیں۔

اقبال کہتا ہے۔

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　　راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

ایک موقعہ پر عمل کی یہ تعلیم دیتے تھے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکون　　　کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

عمل کو زندگی کا جوہر اس طرح بتاتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　　سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبالؔ ہر آزار کا مداوا جستجو سمجھتے ہیں۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغِ آرزو رہنا　　　علاج زخم ہے آزاد احسانِ رفو رہنا

جمود و بےحسی سے بیزار ہیں۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے　　　چمن کے ذرہ ذرہ کو شہید جستجو کر دے

دوسری جگہ اس طرح کہتے ہیں۔

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز　　　کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے　　　اے مردِ خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

جستجو و تلاش کا نقیب قناعت و توکل کو نوجواں کے لئے زہر ہلاہل سمجھتا ہے۔ ہمیشہ بلند حوصلگی اور جستجو کی تعلیم دیتا ہے۔

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

اقبالؔ تقدیر کا قایل ہے۔ مگر عمل کی بے پناہ قوتوں کے اسرار نوجوانوں پر اس طرح فاش کرتا ہے۔

راز تقدیر ہے یہ راز جہاں تگ و تاز　　　جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

ایک جگہ کہتے ہیں۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ　　　وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

اقبال نواجوانوں کے خیالات اور افکار سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے نوجوانوں کو جو زندگی کے شاہراہ بتائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ان ہی کا حصہ تھا۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں — پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو تیرے احوال کہ میں بھی — مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

اخلاق کی تعمیر میں کیریکٹر بہت نمایاں ہے۔ نوجوانوں کی آرام پسندی اور زندگی کی رنگینیوں کو سم قاتل بناتے ہیں۔

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اقبال کے نزدیک تعلیم جو مذہب سے خالی ہو نوجوانوں کے لئے مضر ہے۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا اُلٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
پائی نہ ملازمِ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

تعمیر اخلاق میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذکر تھا۔ تعلیم و تربیت کی اہمیت جس قدر ہے محتاج بیان نہیں نئی نئی تحقیقاتیں ہو رہی ہیں۔ تعلیم کے مختلف نظریوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اقبال کا خیال ہے۔ کہ اس تعلیم سے ذہنی و فکری بلندی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ مذہبی تعلیم اس کا جزو نہ ہو۔ تعلیم کے ذیل میں اقبال کا استفسار اور پیر رومی کا جواب سن لیجئے۔

مریدِ ہندی — چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیرِ رومی — علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مریدِ ہندی۔ پڑھ لئے میں نے علوم شرق وغرب
روح میں باقی ہے اب تک دردوکرب

پیر رومی دستِ ہر نا اہل بیمار ت کند
سوے مادر آکہ تیمار ت کند

مریدِ ہندی علم وحکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوزِ درد وداغ

پیر رومی علم وحکمت زاید از نان حلال
عشق ورقت آید از نان حلال

اقبالؔ چاہتے ہیں کہ نوجوانوں میں طلب علم کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔ "طالب علم" کو خطاب کرکے کہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

موجودہ طرز تعلیم سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ موجودہ طرز تعلیم صحیح علمی مذاق پیدا نہیں کرتا۔

سُنئے۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط ونظام

اقبالؔ نوجوانوں کے لئے ایک آئیڈیل رہنما ہے۔ اس دور کے موجودہ نوجوانوں کو ملک کے قوانین کی پابندی ازبس ضروری سمجھتا ہے۔ خیالات کی آزادی کو جوکہ ملک اور سوسائٹی کے امن کو منتشر کرے وہ بہت برا سمجھتا ہے۔

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ　　　آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد
آزادیِ افکار سے ہے اُن کی تباہی　　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے　　　موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اقبالؔ نے ہوس پرستی اور زندگی کی رنگینیوں کی جا بجا مذمّت کی ہے۔ ان کے نزدیک جوانوں کا اعلیٰ کیریکٹر دولتِ قارونؔ اور فکرِ افلاطون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ کہتے ہیں۔

ضمیر پاک نگاہ بلند مستیِ شوق　　　نہ مال و دولتِ قارون نہ فکرِ افلاطون
نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی　　　کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

جاویدؔ کے نام لکھتے ہیں۔

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی　　　خدا کرے کہ جوانی تیری رہے بے داغ

ساتھ ہی جاویدؔ کے نام ایک دوسرے خط کا حصّہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو　　　سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے　　　خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نوجوانوں کے سامنے مسائلِ حاضرہ کو بھی پیش کیا ہے۔ اور دنیا کے بین الاقوامی مسائل کو جن کے سلجھانے میں آج بڑے بڑے دماغ غور و فکر میں لگے ہوئے ہیں حل کیا ہے۔ اس سے قبل کہ ان مسائل کو عرض کروں مختصراً یہ عرض کروں گا۔ کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ اقبالؔ کا نظریہ خالص سیاسی ہے۔ یا اس کی بنیادیں اس سے بھی گہری ہیں۔ بعض مغربی اور مشرقی نقّاد کہتے ہیں۔ کہ اقبال نے بہت حد تک ولیم بلیک۔ نیٹشے اور برگساں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبالؔ اور نیٹشے اقبال اور برگساں میں بعض معاملات میں اتحادِ خیال پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ صرف معمولی سی وحدتِ خیال اس امر کے لئے ایک محکم ثبوت نہیں بن سکتی کہ اقبال نے تمام تر خیالات اِن فلسفیوں سے لئے ہیں۔

بلکہ اقبالؔ بہت حد تک مغربی تخیل سے نفور ہیں۔ اقبالؔ کو نیٹشے اور برگساںؔ سے اکثر اہم معاملات میں اختلاف ہے۔ جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں۔ فارسٹر اور ڈکنسن کا یہ خیال ہے۔ کہ اقبالؔ کا نظریہ سیاسی ہے۔ مگر یہ نظریہ بہت سطحی مطالعہ کی بنا پر قائم کیا ہے۔ اقبالؔ اس سیاسیات سے متنفر ہے۔ جس میں مادیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کو شکایت ہے۔ کہ تہذیب جدید کے تمام شعبے مادیت اور عقلیت کے جراثیم سے متاثر ہیں۔ اقبالؔ اوس کی مذمت کرتے ہیں۔ مگر یہ مذمت لینن۔ ایچ جی ویلز اور برنارڈ شا کی مذمت سے جداگانہ ہے۔ اقبالؔ ایک زندہ اور ہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے۔ جو تہذیب حاضرہ موجودہ اندازِ خیال موجودہ جذبات اور ارادوں سے بالکل جدا ہوگی۔ جس کے سب افراد مافوق الانسان ہوں گے۔ جو خدائے لم یزلی کے زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ نئی سوسائٹی۔ مساوات اور یک جہتی کا زندہ نمونہ ہوگی۔ اور اس میں مادیت اور عقلیت سے پیدا شدہ متذکرہ بالا نظریہ کے پیش نظر اقبالؔ نے تہذیب حاضرہ کے مسائل کو حل کیا ہے۔ اور

اشتراکیت۔ ابی سینیا۔ جمہوریت۔ کارل مارکس۔ مسولینی۔ جمعیت اقوام۔ سلطنت وغیرہ وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ اور نوجوانوں کو دعوت فکر دی ہے۔

طوالت کے لحاظ سے میں نے ان مسائل کو جو اقبالؔ نے پیش کئے ہیں۔ نظرانداز کیا ہے۔ لیکن ایک اہم مسئلہ پر ضرور کچھ عرض کروں گا۔ آزادی نسواں کا مسئلہ سب سے زیادہ نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اقبالؔ کا فیصلہ اس پر سن لیجئے۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

آگے کہتے ہیں۔

اک زندہ حقیقت میرے سینہ میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا		اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

حضرات اقبالؔ نے نوجوانوں کے لئے ایک لائحہ عمل قائم کیا ہے۔ اوس کی آرزو ہے۔ ان کے دلوں کے تاریک گوشوں سے نفاق اور اختلاف کی سطوت اور تسلط کا خاتمہ ہو۔ اور وہ زندگی اور بیداری کی راہوں کو اختیار کر کے اس پرشور زندگی میں کامیاب ہوں۔ نوجوانوں کے لئے۔ خداوند جل شانہ کی بارگاہ میں دعائیں مانگی ہیں۔ آہِ سحرگاہی اُن کے لئے وقف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نوجوان بھی ستارہ صبح کے ساتھ بیدار ہوں۔ ساقی نامہ میں دعا سنئے۔

جگر سے وہی تیر پھر پار کر		تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر		زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے		میرا عشق میری نظر بخش دے

ایک جگہ کہتا ہے۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لایق وہ جوان		جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش

نوجوانوں کو اقبالؔ کی یہ تلخ نوائی شاید بارِ خاطر ہوئی ہوگی۔ مگر صدق مقال و حق گوئی اس کا عقیدہ ہے۔ نوجوانوں کو خود بھی صدق مقالی اپنا وظیفہ حیات بنانا چاہتا ہے۔ اقبالؔ خود بھی اپنی تلخ نوائی سے واقف ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق		نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش		میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ضرب کلیم میں محراب گل افغاں کے افکار میں اقبال نے ایک آئیڈیل نوجوان پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا		شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر		اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز — کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی — کہ اوس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اوس کی بے کلاہی کو — یہ بے کلاہی ہے سرمایۂ کلاہ داری

اقبالؔ ہماری موجودہ دنیا میں زندگی کا سفیر ہے۔
ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے اُن کو سبق خود شکنی خودنگری کا

حضرات! نوجوانوں سے خطاب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس عرصہ کائنات میں زندگی کا ایک معرکہ برپا ہے۔ اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں۔ افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں۔ وہی زندہ اور جیتا رہے گا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا۔ اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور نرم بستر کا جویا ہوا دنیا اُس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشہ میں ڈال دے گی اور افراد اور قومیں اُس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی زندگی کا فلسفہ صرف جد وجہد محنت اور سخت کوشی ہے۔ بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے۔ اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے۔

آج اقبالؔ کی نظریں نوجوانوں پر ملک کی ترقی کے لئے لگی ہوئی ہیں۔

"اقبال اور عشقِ رسول"

(شیخ عطار اللہ صاحب ادارہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

یوم اقبال حقیقت میں ملّت اسلامیہ کے لئے پیام اقبال ہے۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز — بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اقبال و وقار کو پہچاننے کی توفیق بخشی۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس گئے گذرے زمانے میں ملّتِ بیضا کی عزیز ترین ہستیوں میں سے ہیں اور اپنے آپ کو ملّت بیضا کی خاک پا سمجھتے ہیں پس ایسی مقدس خاک کے سرمے سے مسلمان کی آنکھیں بہت پہلے سے روشن ہوجانی چاہئیں تھیں خیر اگر اب بھی صدیوں کی کوری اور کور بختی سے نجات ملے تو ایسا غنیمت ہے۔

من کہ ایں شب راچوں ماہ آراستم — گردِ پائے ملّتِ بیضا ستم

اے کہ زمن فزودۂ گرمی آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

آج کے دن ہمیں اللہ تعالےٰ کے حضور میں سربسجود ہوکر پورے خضوع وخشوع سے دعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالےٰ علامہ ممدوح کو کلی صحت بخشے اور وہ عرصہ تک ملّت اسلامیہ کی خدمت کے لئے زندہ رہیں

علّامہ اقبال کا مرتبہ تاریخ شعر وملّت میں نہایت بلند ہے اُن کا کلام کئی قسم کی کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اُن کے کلام سے اُن کے جذبات اور احساسات کا پتہ لگانا نہایت سہل ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آج اقبال کے شیدائی مختلف عنوانات سے اُس کی ذات وشعر پر مقالات پڑھیں گے۔ اقبال اور وطن۔ اقبال اور اشتراکیت۔ اقبال اور شعر۔ اقبال اور مومن۔ اقبال اور قلندر و درویش۔ اقبال اور مشرق۔ اقبال اور افرنگ کتنے ہی مضامین ہیں جن پر لکھنے کو

جی چاہتا ہے لیکن میں نے بلاتامل اقبال اور عشقِ رسول اپنے مقالہ کا عنوان قرار دیا ہے کیونکہ میں اسی موضوع کو علاّمہ اقبال کی شاعری کی قوت محرکہ اور زندگی کا سرمایۂ سرور سمجھتا ہوں۔

اقبال بزبانِ اقبال

نفس مضمون کی طرف متوجہ ہونے سے پیشتر میں مختصر طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کون اور کیا ہیں لیکن یہ نہیں کہ کہاں پیدا ہوئے کس جگہ تعلیم پائی اُن کے اُستاد کون بزرگ تھے اگرچہ مجھے مولوی میر حسن صاحب کی خدمت میں ۱۹۱۵-۲۹ء تک بسلسلہ ملازمت مرے کالج حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ اُستاد کو دیکھا اور شاگرد کو پڑھا ہے اقبال کی احساس شناس طبیعت نے خوب اعتراف کیا ہے جب یہ کہا ہے۔

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے

اقبال کے تعارف سے مراد اُس کے احساسات اور جذبات اُس کی اُمیدوں اور آرزوں کا اظہار ہے۔ اقبال ہندو الاصل صاحب بصیرت مسلمان اور ایک مردِ حق آگاہ ہے جس کی آرزو قرن اول کی شان اسلامی کا دوبارہ ظہور ہے وہ کشمیری الاصل ہیں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ دنیاوی حالات نے مساعدت نہیں کی۔ خدا نے انھیں ایک بینوا درویش پیدا کیا۔ ایک سید زادے سے خطاب ہوتا ہے۔

میں اصل کا خاص سومناتی   آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد،   میری کفِ خاک برہمن زاد،

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

بیا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسلام اور ملت اسلامیہ سے اپنی شیفتگی کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغ چشم من است   ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز
مرا اگرچہ بہ بتخانہ پرورش دادند   چکید از لبِ من آنکہ در دلِ حرم است

کشمیر آبائی وطن

اقبال کو اپنے آبائی وطن سے محبت ہے اور اُس کا اظہار جا بجا ہوتا ہے لیکن اسلام کی نسبت ایک سچے مسلمان کی طرح ہر دوسری نسبت پر غالب ہے۔

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر، دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

کم سنی میں کشمیر کی نسبت نہایت عزیز تھی۔

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے، اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

کشمیر جنت نظیر کی تعریف اقبال نے دل کھول کر لکھی ہے۔ وجد انگیز اشعار ہیں۔ کشمیر کو دنیا نے جنّت نظیر کہا اور شعراء کا یہ فیصلہ بلا دلیل صدیوں قایم رہا اقبال سے پہلے کشمیر کی سب سے بڑی تعریف یہ تھی ؎

اگر فردوس بر روے زمین است ہمین است وہمین است وہمین است

لیکن کشمیر کے فردوس ہونے کا ثبوت علامہ ہی نے بہم پہنچایا ہے اور میں سمجھتا ہوں اب دین دنیا تک کشمیر کی اقبالی تعریف قطعی چیز ہوگی۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را رہا سازد از محنتِ انتظارے

شاعری اور پیام اقبال

اقبال جیسا سخنور اور اُس کے مدعاے شاعری کے ساتھ آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اقبال کی شاعری

اسلام کا ایک پیامِ حیات افروز اور دنیائے ادب کا ایک انقلاب ہے۔

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست ــــــ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری ــــ وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

گل و بلبل کی شاعری چاہنے والوں سے گلہ ہے۔

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ــــ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم ــــ تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من ــــ رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیِ جانم نہ دید ــــ آشکارم دید و پنہانم نہ دید

پیامِ مشرق کے انتساب منظوم میں گوئٹے اور اپنا مقابلہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

او چمن زادے چمن پروردۂ ــــ من دمیدم از زمینِ مردۂ

اپنی زندگی کے مختلف اعتبارات کو یکجا کر دیا ہے۔

کوئی دیکھے تو میری بے نوازی ــــ نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ ــــ طبیعت غزنوی قسمت ایازی

اقبال کو ہمیشہ اپنے دردِ نہاں کے محرم کی تلاش رہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ محفل آن کے رازداروں سے خالی ہے۔

اقبال اپنا محرم ملتا نہیں جہاں میں ــــ معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا
تابِ گفتار اگر ہست شناسائے نیست ــــ وائے آں بندہ کہ در سینہ او رازے ہست
من مثالِ لالۂ صحرا استم ــــ درمیانِ محفلے تنہا استم

دعا کرتے ہیں۔

خواہم از لطفِ تو یارِ ہمدمے ــــ از رموزِ فطرتِ من محرمے

ہمدمے دیوانۂ فرزانہ — از خیال این و آں بیگانہ،
تا بجاں او سپارم ہوئے خویش — باز بینم در دلِ او روئے خویش
سازم از مشتِ گلے خود پیکرش — ہم صنم او را شوم ہم آذرش

ملتِ اسلامیہ سے اپنی شاعری اور اُس کی غایت کے متعلق خطاب ہوتا ہے۔

ہمنوا از جلوۂ اغیار گفت — داستانِ گیسوئے و رخسار گفت
بر درِ ساقی جبیں فرسود او — قصۂ مغ زادگاں پیمود او
من شہیدِ تیغ ابروے توام، — خاکم و آسودۂ کوئے توام
از ستایش گستری بالاترم — پیش ہر دیواں فرو ناید سرم
از سخن آئینہ سازم کردہ اند — وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بر درت جانم نیاز آوردہ است — ہدیہ سوز و گداز آوردہ است
ز آسماں آبگوں یم می چکد — بر دلِ گرمم دمادم می چکد
من ز جُو باریکتر می سازمش — تا بہ صحنِ گلشنت اندازمش

وجہ کیا پیاری ہے۔

زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی — ہم چو دل اندر کنارِ ماستی
مثلِ گل از ہم شگافم سینہ را — پیش تو آویزم ایں آئینہ را

مدعا کیا ہے۔

تا نگاہے افگنی بر روے خویش — می شوی زنجیری گیسوئے خویش
جانم اندر پیکرے فرسودہ — جلوۂ آہے است گرد آسودہ
چوں مرا صبحِ ازل حق آفرید — نالہ در ابریشمِ عودم تپید
نالۂ افشا گرِ اسرارِ عشق — خونبہاے حسرتِ گفتارِ عشق

فطرتِ آتش دہد خاشاک را
شوخیِ پروانہ بخشد خاک را

من ہمیں یک گل بدستارت زنم
محشرے برخوابِ سرشارت زنم

تا ز خاکت لالہ زار آید پدید
از دمت بادِ بہار آید پدید

مختلف قلبی کیفیتوں کو یوں بیان فرمایا ہے

عیبِ من کم جوئے و از جامم عیارِ خویش گیر
لذتِ تلخابِ من بے جاں غمِ فرسودنے

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سفت

سِرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں رازہائے نتواں نہفت

حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود
نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

آرزو

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

رہ دہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

مُردوں کی طرف سے مایوسی ہے۔

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داوٗد

مایوس نہیں ہوئے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

عشقِ رسول

اقبال کی تربیت جس اُستاد اور باپ کے زیر سایہ ہوئی وہ شیفتگان رسول سے تھے اور مومنانہ صلاحیت نے اقبال کے دل و دماغ کو حضور سرورِ کائنات کی محبت سے ایسا منور کر دیا کہ باقی تمام چیزیں بحر ظلمات ہیں۔ محبت ہے تو رسول سے اُس کی اُمت سے اُس کی تعلیم سے۔ مسلمان کے لئے ذریعہ نجات ہے تو رسول کی پیروی میں۔

یثرب سے محبت

تجھ میں راحت اُس شہنشاہ معظم کو ملی، — جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
خشک لب انساں کو جس نے آبِ جاں پرور دیا — عقل کو آزادِ زنجیرِ توہم کر دیا
جس نے عہدِ وصل باندھا مدتِ دوراں کے ساتھ — جس نے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کے ساتھ
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے

ملت اسلامیہ سے محبت

اگر یثرب سے محبت ہے اس لئے کہ وطن رسول ہے تو مسلمانوں سے اس لئے محبت ہے کہ وہ اُس رسول کی اُمت ہیں۔ ملت اسلامیہ سے اُن کا خطاب۔

من شہیدِ تیغِ ابروے توام، — خاکم و آسودۂ کوئے توام
من کہ ایں شب را چو ماہ آراستم، — گردِ پائے ملت بیضاستم

دنیا کی تمام رنگینیاں۔ رعنائیاں اور محبوبیاں محمدؐ کی ذات سے ہیں۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا است — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

زندہ اور حقیقی مصطفوی جاننا چاہتا ہے پوچھتا ہے۔

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا است — سرِ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است

آدمی باجوہرِ اندر وجود ، آنکہ گاہے گاہے آید در وجود

حلاج جواب دیتا ہے۔

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالا ترست ، زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست

حضور سرور کائنات کا رنامہ ملت اسلامیہ کی تخلیق۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ مارا در دلِ او ریختند ملتے از خلوتش انگیختند

دین مصطفیٰ کیا چیز ہے

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات شرع او تفسیر و آئینِ حیات
گر زمینِ آسماں سازد ترا ، آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

رسولِ اکرم کا مقام اور اُن کے احسانات ۔ نعت کے بہترین نمونے۔

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد مسندِ اقوام پیشیں در نورد ،
از کلیدِ دین درِ دُنیا کشاد ہمچو او بطنِ ام گیتی نزاد ،
در نگاہِ او یکے بالا و پست باغلامِ خویش بر یک خواں نشست
در مصافے پیش آں گردوں سریر دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست او در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے
آں بیاراں ایں باعدا رحمتے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت گشاد
آنکہ را پیغام لاتثریب داد

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم ـ آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدہ او اشکبار اندر نماز

ہست معشوقے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمایت،

عاشقانِ او ز خوباں خوب تر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر

دل ز عشقِ او توانا می شود،
خاک ہمدوشِ ثریا می شود

خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

مسلمانوں کا تنزل آئینِ محمدؐ کے ترک کی وجہ سے ہے۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو،
از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

باطنِ ہر شے ز آئینِ قوی
تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

باز اے آزادِ دستورِ قدیم
زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم

تا شعارِ مصطفےٰ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

مسلمان اپنی غیر اسلامی زندگی کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں کہ رسول اکرمؐ پر درود بھیج سکے کیونکہ محمدؐ سے محبت اور عمل کی یہ کمزوریاں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

گرچہ داناحال دل باکس نگفت　　　از تو درد خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام،　　　ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفٰے خوانم درود　　　از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر　　　سینہ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو　　　از درودِ خود میالا نام او

جوانی کی ترنگ میں اقبال نے ایک مرتبہ ایک سائل کو پیٹا اور اُن کے والد بزرگوار کو یہ سخت ناگوار ہوا

بر لبش آہے جگر تابے رسید　　　در میان سینۂ او دل تپید
کوکبے در چشم او گردید و ریخت　　　بر سرِ مژگاں دمے تابید و ریخت
ہمچوں آں مرغے کہ در فصلِ خزاں　　　لرزد از بادِ سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم　　　رفت لیلائے شکیب از محملم،

نیک بخت باپ نے لڑکے سے کہا بیٹا وہ وقت یاد کرو جب میدان حشر میں ایک غریب فقیر مومنین کے گروہ میں کھڑا رسول اللہ سے فریاد کر رہا ہوگا۔

درمیان انجمن گرد د بلند،　　　نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی　　　من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی
حق جوانے مسلمے با تو سپرد　　　کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد　　　یعنی آں انبارِ گِل آدم نشد
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر　　　اجتماعِ اُمتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفید من نگر،　　　لرزۂ بیم و امید من نگر،
بر پدر ایں جور نازیبا مکن　　　پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفٰی　　　گل شو از بادِ بہارِ مصطفٰی

از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرہ از خُلقِ او باید گرفت

پیروی سنت کی دعوت

کاملِ بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو شود گردوں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں　　ترک خود کن سوئے حق خلوت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن　　لات و عزّائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق　　جلوہ گر شو بہ سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح انی جاعل سازد ترا

اضطراب شوق ملاحظہ ہو

بہر دہلیز تو از ہندوستان آوردہ ام　　سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من
تیغ لا در پنجۂ ایں کافرے دیرینہ دہ　　باز بنگر در جہاں الائے من
از پسر بارگاہت یک جہاں واقف نصیب　　جلوہ داری دریغ از وادیِ سینائے من
با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار　　یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

دردناک مناجات

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں خواب میں سر سید علیہ رحمتہ کے ایما سے اپنی بیماری سے رسولِ خدا کے دربار میں فریاد کی ہے

شہسوارا یک نفس در کش عنان　　حرفِ من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب　　می نہ گردد شوق محکومِ ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند　　ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند

گرد تو گردد حریم کائنات — از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوئے زار و زبون و ناتواں — کس بفتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم بوئے تو

علامہ اقبال کا گلا بیٹھ گیا اور بلند اور صاف آواز نہیں نکلتی نہ دیر تک گفتگو فرما سکتے ہیں۔ اس بیچارگی کو کس اندازِ فریاد میں پیش کیا ہے

آں نوا در سینہ پروردن کجا — وز دمے صد غنچہ وا کردن کجا
نغمۂ من در گلوئے من شکست — شعلۂ از سینہ ام بیروں بجست
در نفس سوزِ جگر باقی نہ ماند، — لطفِ قرآنِ سحر باقی نہ ماند
نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر، — تا کجا در سینہ ام ماند اسیر

یک فضائے بیکراں می بایدش
وسعتِ نہ آسماں می بایدش

آہ زاں دودے کہ در جان و تن است — گوشۂ چشم تو داروئے من است
چوں بصیری از تو می خواہم کشود — تا بمن باز آید آں روزے کہ بود (آمین)
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است — در خطا بخشی چو مہر مادر است
با پرستارانِ شب دارم ستیز — باز روغن در چراغ من بریز (آمین)

گنہگار کا سرمایہ ایک محبت بھرا دل ہے۔

گرچہ کشت عمر من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشم جہاں — کز سم شبدیز تو دارد نشاں

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب | بندہ خود را حضور خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر | دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے | تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثلِ چوب نیم سوز | کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز
اندریں دشت و درے پہناورے | بو کہ آید کاروانے دیگرے

جاں زمہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من اے وائے من

اقبال کی دعا اور آرزو

مسلمان کی حالت حضور رسالتماب میں عرض ہوتی ہے

اے ظہور تو شباب زندگی | جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند | آسماں از بوسۂ پایت بلند
شش جہت روشن زتابِ روئے تو | ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات | فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی | بندگاں را خواجگی آموختی،
تا مرا افتاد بر رویت نظر | از اب وام گشتۂ محبوب تر
مسلم از سِرّ نبی بیگانہ شد | باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ | سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ
نعشش از پیش طبیباں بردہ ام | در حضور مصطفیٰ آوردہ ام

اقبال عرض کرتا ہے کہ اگر اُس نے اپنی قوت تعلیم اسلام کی ضرورت و محبوبیت ظاہر کرنے کے علاوہ کسی طرح پر ظاہر کی ہو تو وہ بڑی سے بڑی سزا کے لایق ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

اے فروغت صبح اعصار و دہور
چشم تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں راز خارم پاک کن

تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملّت رانگہدار از شرم

سبز کشتِ نابسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن،

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من،

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اپنی مسلمان دوستی کا واسطہ دے کر توفیقِ عمل کی دعا چاہتے ہیں

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است
یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل،

دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ
بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

حقیقی آرزو۔

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام
آرزوے دیگرے پروردہ ام

ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است
محرم از صبحِ حیاتم بودہ است

از پدر تا نامِ تو آموختم،
آتشِ ایں آرزو افروختم

تا فلک دیرینہ تر سازد مرا
در قمارِ زندگی بازد مرا،

آرزوے من جواں ترمی شود — ایں کہن صہبا گراں ترمی شود
ایں تمنا زیر خاکم گوہر است — در شبم تابِ ہمیں یک اختر است
مدتے بالالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم،
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گرد حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم
ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت — ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت
ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانۂ چشمم چکید — در ضمیرِ من نواہا آفرید،

انداز بیان ملاحظہ ہو ایک مصرعہ کتنے ہی دواوین کو شرماتا ہے۔ ایک خطا کار غلام کس انداز سے اظہار آرزو کی خواہش کرتا ہے

اے ز یادِ غیر تو جانم تہی، — بر لبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی از عمل ساماں نہ بود — پس مرا ایں آرزو شایاں نہ بود
شرم از اظہار او آید مرا — شفقتِ تو جرات افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانہ — تا کجا زناری بتخانہ
حیف چوں او سرآید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار،
از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشائے فردائے من
فرخا شہرے کہ تو بودی دراں — اے خنک خاکے کہ آسودی دراں
کو کبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتاب من — بستگی پیدا کند سیماب من،

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

ملّت اسلامیہ کی زندگی عشق رسولؐ کی تازگی سے ہے۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست — بحر و بر در گوشۂ داماں اوست
سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب — ذرۂ عشق نبیؐ از حق طلب
زانکہ ملّت را حیات از عشق اوست — برگ و سازِ کائنات از عشق اوست
جلوۂ بے پردۂ او وا نمود — جوہر پنہاں کہ بود اندر وجود

روح را جز عشق او آرام نیست
عشق او روزیست کو را شام نیست

بہار نامۂ ہندی

(شیخ عبدالحق صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی)

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ و اصحابہ اجمعین

(۱)

خیمہ زن ہے چمن میں ابر بہار / زندگی کے ہیں ہر طرف آثار
کچھ برستی ہے اس طرح سے پھوار / خلد میں جیسے ریزشِ انوار
یاسمن، جوہی، نسترن، بیلا / کارواں کارواں، قطار قطار
اک طرف خندۂ گلِ رنگین / اک طرف آہِ عندلیبِ زار
اک طرف ہے نسیم عنبر بیز / اک طرف ہے چنار آتش بار
اک طرف اک جہانِ تنہائی / اک طرف اک جہانِ بوس و کنار
اک طرف سنبل اک طرف لالہ / اک طرف سرو، اک طرف گلنار
اک طرف تختۂ گلاب کا رنگ / اک طرف نسترن کی نقش و نگار
اک طرف آفتاب، نور افشاں / اور اک سمت، ابر گوہر بار
اک طرف ہے سکونِ زیرِ درخت / اک طرف ٹہنیوں پہ چیخ پکار
نغمہ سازِ ازل نے چھیڑے ہیں / اک طرف دیپک اک طرف گندھار
دل میں سبزے کے حسرت پابوس / چشمِ نرگس کو حسرتِ دیدار
نغمہ زن قمریِ ترانہ سنج / نالہ کش عندلیب سینہ فگار
آب جو نغمہ سنجِ موسمِ گل / اور ہوا مدح گوی فصلِ بہار
موج کی موج سے ہم آغوشی / آبشاروں کے لب پہ شور پکار
جملہ تصویرِ تمکنت دریا / جملہ آئینِ ناز جوئبار

اک طرف وہ روانیٔ دریا — اک طرف وہ خموشیٔ کہسار
نظر آتے ہیں دونوں دوش بدوش — اک طرف ثابت اک طرف سیار
خوب فطرت بنائی دونوں کی — اک مشتاق دوسرا بیزار
نظر آتی ہے یوں افق پہ شفق — سرخ جیسے ہوں یار کے رخسار
یوں نسیمِ سحر کی آمد ہے — جیسے کوئی حسین سبک رفتار
اک قیامت ہے آب جو کے قریب — ایک ہنگامہ ہے سرِ گلزار
وہ پپیہے کا شور، وہ 'پی' 'پی' — آم کے بن میں کوئلوں کی پکار
آج قرطاسِ دہر رنگیں ہے — دستِ قدرت ہے خوب نکتہ نگار
اِس چمن کی بہارِ لاثانی — باغِ فردوس اِس کا باجگزار
آج صوفی ہے مستِ عیش و نشاط — شیخ ہے آج رندِ بادہ خوار
کاش کہدے پکار کر کوئی — ہے کھلا آج بابِ استغفار
کوئی دیکھے چمن کی دنیا کو — فاش قدرت نے کر دیئے اسرار
آج ہر ابر، ابرِ نیساں ہے — آج ہر قطرہ ہے دُرِ شہوار
آج ہر نخلِ خشک ہے شاداب — آج ہر شاخسار ہے گلبار
ہر قلم، آج شاخِ غنچہ ریز — ہر کشش آج ہے خطِ گلزار
کون سمجھے مطالبِ نازک — ہے چمن آج، مخزن الاسرار

آہ بے یار آئی فصلِ بہار
کیجئے کس پہ اپنی جانِ نثار

(۳)

گر کہوں بے نقاب اپنا راز — فقہا، دینگے فتویٔ تکفیر

گر گردن میں موافقت اپنی — ہوں مخالف میرے جوان و پیر
عشق کی گرمیاں، معاذ اللہ — ہے لبِ برہمن پہ بھی تکبیر
ذہن میں کس کے آئے میری بات — کون سمجھے نوشتۂ تقدیر
حسن اپنا عیار کھوتا ہے — عشق کرتا ہے دو جہان تسخیر
حسن کی خود نمائیوں پہ نہ جا — عشق کی بارگاہ میں ہے حقیر
حسن بھی ہے اگرچہ لاثانی — عشق کی بھی کوئی نہیں ہے نظیر
حسن کو بھی ضرورتِ تشریح — عشق کو بھی ہے حاجتِ تفسیر
حسن کی ہیں کراتیں بیحد — عشق کے بھی ہیں معجزاتِ کثیر
حسن بھی عشق کا ہے دامن کش — عشق بھی حسن کا ہے دامنگیر
حسن میں بھی ہے اک جہانِ کشش — عشق میں بھی ہے جذبِ عالمگیر
حسن کا ذرہ ذرہ ضوافشاں — عشق کا ذرہ ذرہ، مہرِ منیر
حسن کی ہر ادا میں آگ نہاں — عشق کی ہر روش ہے آتشگیر
حسن بھی روکشِ بہارِ عجم — عشق بھی رشکِ خطۂ کشمیر

یعنی میرا نہیں جواب کوئی
یعنی تیری نہیں ہے کوئی نظیر

(۳۷)

فکرِ دنیا، و فکرِ مافیہا — کچھ نہیں جز دروغ راست نما
اک حکایت جنید و بسطامی — اک کہانی سکندر و دارا
یہ فقیری ہے اک فریبِ خرد — یہ امارت ہے نفس کا دھوکا
آسمان و زمین مشتِ غبار — تودۂ خاک گلشن و صحرا

کل وہی ہوگا خستہ پیرِ ضعیف
آج جو ہے جواں بتِ رعنا

کل وہی ننگِ حسن ورعنائی
آج وہ رشکِ کشمر و یغما

کل کفن پوش بے حس وحرکت
زیب تن آج اطلس ودیبا

چرخ کی یہ فریب کاری دیکھ
آج امروز اور کل فردا

کل جسے فرش خاک ہوگا نصیب
آج وہ تخت پر ہے جلوہ نما

اک حکایت ہے عقد ماہی جہاں
اک فسانہ ہے فکرِ ما فیہا

جن کے دل میں ہے گرمیٔ الفت
ان کو سود وزیاں کا کیا کھٹکا

تو میرا کیا بنے گا الفت میں
درحقیقت نہیں ہے تو اپنا

(۴)

توحقیقت شناس کیا ہوگا
تیری آنکھوں پہ ہے نظر کا حجاب

اسکو گردش ہے اسکو ذوقِ فنا
ایک ہیں یہ حباب اور گرداب

دل ہے ناواقفِ سرورِ سرود
بزمِ ماتم ہے تیری بزمِ رباب

تو تہی دست، وہ تہی ایماں
تجھ سے بڑھکر فرنگ خانہ خراب

تیرا ہر ذرہ خوگرِ تجدید
اس کی ہر شان جلوہ پا بہ رکاب

گر بڑھی مفلسی تو شیخِ حرم
بھول جائیگا سیم وزر کا نصاب

بارِ افلاس کس سے اٹھتا ہے
خود بخود خم ہیں آج کل محراب

دیکھتا ہوں کہ ہوتی جاتے ہیں
رہنِ افرنگ منبر و محراب

اک تجارت ہے تیری ملّائی،
نسخۂ کیمیا خدا کی کتاب

بے خبر ہے مری نواؤں سے
ابھی مغرب ہے مستِ چنگ و رباب

ننگِ مشرق ہو تیری پیری
وقفِ مغرب ہی تیرا عہدِ شباب

(۵)

کیا بتاؤں رموزِ فاروقیؓ — تو نے سیکھی نہیں ہے کرّاری
کوئی عیسائی عرب سے کہدے — زخمِ تہذیب ہے بہت کاری
ھند کے انقلابِ بہیم سے — ابھی غافل ہیں ترک و تاتاری

قطعہ

دن بدن مے فروشِ مغرب کی — ہوئی جاتی ہے پختہ عیاری
آہ، یہ ہند، رندِ سادہ لوح — ہے فزوں اس کا شوقِ میخواری
ہے یہ محتاجِ مے، وہ بادہ فروش — ہے یہی وجہِ گرم بازاری
ہند پر ہے جنوں کا بوسی — کون کہتا ہے اِسکو ہشیاری
جس سے بیدار ہوں نگاہ و دل — درحقیقت وہی ہے بیداری
تیری مژگاں بھی تجھ سے تر نہ ہوئی — پھر بھی سیلِ سرشک ہے جاری
نہ سُنا، حُریت کا افسانہ — ہے یہ گفت و شنید بازاری

حشر کے واسطے کفایت ہے
ایک آزاد کی گرفتاری

(۶)

سن اِے ناشناسِ بحرِ حیات — کہہ رہا ہوں میں تجھ سے راز کی بات
آہ، تو ہے سکون کا طالب — ہے تگ و دو کا نام اصلِ حیات
گر سمجھ جائے تو ممات کے راز — پھر تری موت بھی ہے عینِ حیات

روشنی کا طلسم غیب و حضور　　اک فریبِ نظر ہیں دن اور رات
گر نظر پختہ ہو محبت میں　　چاک ہو جائے خود قبائے صفات
غور سے دیکھ انقلابِ جہاں　　ابرِ قدرت کے ہیں یہی رشحات
حشر کا دن اسی کو کہتے ہیں　　تجھ پہ کھل جائے جب طلسمِ حیات
کلمۂ لا الٰہ الا اللہ　　اپنی ہی نفی اپنی ہی اثبات
تنکے ہیں آشیاں میں بجلی کے　　کتنے نازک ہیں میرے احساسات

(۷)

گر عنایت ہے مجھے شعور و تمیز　　گرچہ نعمت کا ہو چکا اتمام
مجھ کو آزاد کیا کیا تو نے　　تیلیاں ہیں قفس کی صبح و شام
سجدۂ شوق کیا ادا ہو گا　　آہ، پابندیٔ قعود و قیام
گر عنایت ہے مجھے وہ ذوقِ سفر　　فکرِ منزل نہ جسمیں عشقِ مقام
تجھ سے ہے میری بندگی قایم　　مجھ سے تیری خدائی کا ہے نظام

یعنی میں بندۂ محبت ہوں
خویشتن ساز، خودنگر، خودکام

(۸)

(مسئلہ عصر و اثراتِ آن)

بندۂ عصر کاش سمجھے تو　　عصرِ حاضر میں نکتۂ اعصار
عصر کیا ہے تجھے نہیں معلوم　　یہ نہیں از قبیل، نور و نار
حرکت اور عصر ایک نہیں　　اُسمیں تقسیم اِس میں ہے تکرار[1]

---

[1] زینو کا نظریہ اسلئے درست نہیں کہ اسنے حرکت کو لمحات پر منقسم کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیر اپنی حالتِ پرواز میں متحرک نہیں ہے بوجہ کہ وہ اپنے ہر محل پر ساکن اور غیر متحرک ہے۔

عصر[1] اور بعد متصل کیا خوب! — یہ نہیں ہے تسلسلِ افکار
سلسلہ[2] عصر کا ہے وجہِ علل — یہ بھی اک بے سمجھ کی ہے گفتار
یہ[3] حکیم یہود نکتہ شناس — گرم ہے جس کا آج کل بازار
جانتا ہی نہیں کہ عصر ہے کیا — گو اضافت کے ہیں صحیح اسرار
ہے نظر اس کی شکلِ اشیا پر — اس کی بنیاد ظاہری آثار
ماہیت سے نہیں ہے بحث اسے — اصلیت سے نہیں اسے سروکار
متفق برگساں سے گرچہ نہیں — پھر بھی ہے کشتۂ خزان و بہار
غلط اندیش ہے یہ مردِ ذکی — اُس کا دل خفتہ، عقل ہے بیدار
ناشناسِ سپہگری ہے تو — عصر حاضر ہے تیغ جوہر دار
منحصر عصر ہی پہ ہیں اقوام — امتوں کا ہے عصر ہی پہ مدار
متبدل ہیں عصر سے بے جان — متغیر ہیں عصر سے جاندار
عصر ہی کے کرشمے ہیں سارے — کوئی آسودہ حال کوئی خوار
رند کے سر پہ عصر سایہ فگن — شیخ کے سر عمامہ و دستار
عصر[4] کے دم سے گردشِ افلاک — عصر کے جز نہیں ہیں لیل و نہار

---

[1] کینٹر کی تحقیقات یہ ہیں کہ عصر اور بعد دونوں دوش بدوش رواں ہیں۔
[2] کانٹ اپنے نظریہ کے مطابق اسباب و علل کو تسلسلِ وقت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔
[3] حکیم یہود سے مراد اینسٹائن ہے جس کے نظریۂ اضافیت سے وقت کی اصلیت پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔
[4] دیکھو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی کتاب تشکیل سیاتِ جدید، تقریر نمبر ۲، اور اینسٹائن کے نظریہ پر تنقید۔

پیچ و خم ہے مگر شکستہ نہیں — ہے مسلسل مثالِ جوئے بار
یہ پہاڑوں کو کاٹ دیتا ہے — تیز تلوار سے ہے اس کی دھار
سلطنت ہو کہ دورِ جمہوری — وہ قدیم اور یہ جدید آثار
اس سے بچ کر نکل نہیں سکتا — کوئی ثابت ہو یا کوئی سیار
یاں تیرا عصر ننگِ طبعیات — واں فلزات سے چمن میں بہار
اک یہاں عصر، قاتل و دشمن — اک وہاں عصر، دلبر و دلدار
اک یہاں عصر سلطنت گرداں — اک وہاں عصر ہے عریضہ نگار

یعنی مشرق ہے عصر سے مرغوب
اور مغرب کا عصر باجگذار

ایک مدت سے دیکھتا ہوں کہ تھا — عصر سے غرب برسرِ پیکار
ابلقِ عصر رک گیا لیکن — ہے ابھی کچھ افق پہ گرد و غبار
آج مغرب میں سب مہیا ہیں — جسقدر ہیں زوال کے آثار
مژدہ، ہندوستان والوں کو — بسترِ مرگ پر ہے ساہوکار
مژدہ مزدور کو کہ چھایا ہے — کشتِ ویراں پہ ابرِ گوہر بار
باغ عالم بدلنے والا ہے — دیکھ یہ انقلاب کے آثار

خیمہ زن ہے چمن میں ابرِ بہار
زندگی کے ہیں ہر طرف آثار

؎ عصر کے وہ اثرات جو حیاتِ انسانی کے لئے مضر ہیں اُن سے بچنے کے لئے ایمان کا ہونا لازمی شے ہے قرآن پاک میں اسی طرف اشارہ ہے:۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا الخ۔

اقبال کا فلسفۂ جہاد

از ظفر احمد صاحب صدیقی ایم - اے (علیگ) لکچرار فلاسفی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جب شاعر مشرق کا "بال جبرئیل" پہلی بار مشتاق نظروں کے سامنے آیا۔ اس وقت بعض کم نظر ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی کم مایگی یا تعصب کی بنا پر مشرق کے اس رخشندہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش شروع کردی۔ اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

لیکن علامہ اقبال سے مجھے جو عقیدت اور ان کے کلام سے جو شغف رہا ہے اس کی بنا پر میرا دل ان اعتراضوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے ان تاثرات نے ایک نظم کی صورت اختیار کرلی۔ چونکہ اس نظم میں میں نے اپنے خیالات کے مطابق علامہ موصوف کے فلسفہ کی توجیہ اور تفسیر کی کوشش کی تھی اسلیئے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے خیالات کو بہ نظر اصلاح اقبال کی خدمت میں مؤدبانہ پیش کردوں۔ علامہ موصوف نے میری نظم کے جواب میں ازراہ کرم ایک نہایت واضح جامع اور بلیغ گرامی نامہ ارسال فرمایا جسمیں انہوں نے اپنے سارے فلسفہ کا عطر اور مخالفین کے اعتراضات اور شکوک کا مکمل جواب پیش کردیا ہے۔ چونکہ نظم اور اس نامۂ گرامی کا عنوان بالا سے بہت گہرا تعلق ہے اسلئے اپنے مضمون کی طرف آنے سے پہلے اس نظم اور خط کو ناظرین کے سامنے پیش کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظم

(اقبال کے معترضین کے جواب میں)

اک دوست کہ میخانۂ مغرب کے ہیں میخوار　　کہنے لگے "اقبال کے ہو تم بھی پرستار"؟
"اقبال کہ اک فلسفی خانہ نشیں ہیں　　رفتار زمانہ سے خبردار نہیں ہیں"
"اشعار میں ہر چند کہ ہے جدت افکار　　ہر لفظ ہے اک آئینہ شوخیِ گفتار

ہر چند کہ ہر درد کی لذّت سے بھرا دل
لیکن میں نہیں ان کے خیالات کا قائل

اس دورِ ترقی میں بھی ہیں جنگ کے حامی
سچ پوچھو تو یہ اُن کے تخیل کی ہے خامی

دیتے ہیں بہت زور وہ تعلیم خودی پر
مطلب یہ ہے بنجا و مسولینی و ہٹلر

لیکن ہے غضب رکھتے ہیں اسلام پہ تہمت
اس پردہ میں سکھلاتے ہیں خونریزی و غارت

لیکن اگر اقبال کی تعلیم کو مانو
چنگیز و ہلاکو کو سیہ کار نہ جانو

حجّاج کو الزام نہ دو ظلم و جفا کا
دو عتبہ و بوجہل کو رتبہ شہدا کا

بیشک تھی خودی انکی بہت ارفع و اعلیٰ
عالم کو کیا ان کی خودی نے تہ و بالا

اقبال تو خیر اپنے تعصّب سے ہیں ناچار
اسلام بھی کیا ایسی خودی کا ہے طرفدار؟

تا دیر رہی یونہی زباں ان کی گہر ریز
لیکن ہوئی جب ختم یہ تقریر دلاویز

میں نے کہا "گر خاطرِ نازک پہ نہ ہو بار
اک تلخ حقیقت کا ہے کرنا مجھے اظہار

سمجھا ہی نہیں آپ نے اقبال کی لَے کو
ہیں جام یہ نظریں ابھی چکھا نہیں مے کو

اقبال جو کہتے ہیں خودی ہو تری عالی
مطلب یہ ہے تلوار نہ جوہر سے ہو خالی

اشعار میں آتی ہے جو شاہیں کی حکایت
ہے از رہِ تمثیل نہ از راہِ حقیقت،

مطلب یہ ہے سرگرمِ عمل تیری خودی ہو
لیکن یہ ضروری نہیں مسلک بھی وہی ہو

چنگیز و ہلاکو میں بھی اک جوشِ خودی تھا
گم کردہ منزل تھا مگر قافلہ ان کا

افسوس کہ جس قوم کا مقصد بھی ہو عالی
ہو اسکی خودی مردہ عمل جوش سے خالی

(ظفر)

(علامہ اقبال کے اس گرامی نامہ کی نقل جو آپ نے متذکرہ بالا نظم کے جواب میں ارسال فرمایا)

لاہور ۱۲ دسمبر ۳۶ء . . . . جناب من معترض [۱] . . . .

. . . . قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ موخر الذکر صورت میں میں اسے معذور جانتا ہوں۔ آخر اس غلامی کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کونسا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آیندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کر سکے۔ غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔

۲۔ اعتراض کا جواب آسان ہے۔ دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔ اور شریعت اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیۂ اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے

---

[۱] ایک فقرہ حذف کر دیا گیا ہے

عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

۳۔ معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے میں جنگ کا حامی نہیں ہوں نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۹:۴۹ (۱) میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں Collective security کہتا ہے قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے اگر گذشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج کئی صدیاں گذر گئی ہوتیں۔ جمعیت اقوام جو زمانہ حال میں بنائی گئی ہے اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

۴۔ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں (i) خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (ii) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (iii) بلند پرواز ہے (iv) خلوت پسند ہے (v) تیز نگاہ ہے

---

(۱) سورہ الحجرات کی نویں آیت

آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار معمولی خط کتابت سے بھی قاصر ہوں۔ محمد اقبال

متذکرہ بالا خط سے حسب ذیل اہم نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اقبال نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں ہی کو خودی کے نام سے موسوم کرتے ہیں خودی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں ایک تو تعطل اور جمود کی حالت جس میں خودی کی عملی قوتیں مردہ ہوں دوسرے جوش عمل کی وہ حالت جس میں خودی کسی ضابطہ یا قانون کی پابند نہ ہو۔ تیسرے وہ حالت جسمیں خودی کا عمل اور اس کی قوتیں قانون الٰہی و اخلاق کی پابند ہوں۔

حقیقتاً تیسری صورت ہی میں خودی کی اصل رفعت مضمر ہے۔ اور یہی اسلام کا منشا ہے۔ شریعت اسلام کا بھی یہی مقصد ہے کہ انسانوں کی خودی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے۔ خودی کی انتہائی رفعت اس میں ہے کہ اس کا ہر فعل ہر عمل رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ (نہ کہ عمل کو ترک کرنے اور زندگی کی جدوجہد سے منہ موڑنے میں جیسا کہ غلطی سے ہندوستان اور ایران کے اکثر متصوفین نے سمجھا)۔ اقبال کا سارا فلسفۂ خودی اور تمام تعلیم عمل اسی غلط نظریہ کے خلاف جو مسلمانوں کی تباہی و پستی کا اصل ذمہ دار ہے ایک صدائے احتجاج ہے۔ وہ اسلام کی صحیح روح سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے عملی کو خودی کی بقا کے منافی سمجھتے ہیں لیکن بے قید جوش عمل کو بھی خودی کی ارتقا میں سدراہ جانتے ہیں۔

ان نتائج کی روشنی میں اقبال کی تعلیم جہاد کو دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ وہ ظلم یا ناحق کوشی کے لئے جنگ کو کبھی جائز نہیں سمجھتے۔ وہ خودی کو جہاں جوش عمل کی دعوت دیتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر جہاد کی تلقین کرتے ہیں وہاں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ یہ جوش عمل یہ جذبۂ جہاد خود غرضانہ مصلحتوں اور ہوا و ہوس کی اغراض کے لئے ہرگز نہ ہو۔ جہاد کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہیئے یا حق و انصاف کی حمایت اور انسانی ہمدردی۔ چنانچہ اپنے اس یادگار خط میں آگے چل کر وہ وضاحت سے فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید

کی روسے جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ" اصول دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ خواہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے یا ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم اور زیادتی کر رہا ہو دونوں صورتوں میں جہاد حق و انصاف کی حمایت یا بہ الفاظ دیگر رضائے الٰہی کی خاطر ہی کیا جائیگا۔

یہ تھا جہاد کا بنیادی اصول اور اقبال کے پیغام کا مرکزی خیال جو علامۂ موصوف کے مندرجہ بالا گرامی نامے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس بنیادی اصول پر کس طرح وہ اپنی فلسفیانہ شاعری کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دیتے ہیں کس طرح وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں غرض اس سارے اجمال کی تفصیل اُن کے کلام پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے ہو سکتی ہے۔

پہلے مسئلہ خودی ہی کو لیجئے جس پر اقبال کی تعلیم جہاد کی ساری بنیاد ہے۔ اقبال ہمیں خودی یا نفس انسانی کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ

خودی کے نور سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ　　خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سُراغ

حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات　　تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود

ع "وُجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود"

اگرچہ وجود حیات رونق حیات وغیرہ سب خودی ہی کے مظاہر ہیں لیکن خودی ان مظاہر سے مختلف بھی ہے اور ان مظاہر میں جلوہ نما بھی۔ مختصر یہ ہے کہ خودی ایک غیر مادّی غیر محدود اور بے چگوں حقیقت ہے۔ خودی کی اصل اس مادّی دنیا سے نہیں۔ یہ جہاں آب و گل خودی کی امتحان گاہ ہے یا یوں سمجھئے کہ خودی کے سفر ارتقا میں سر راہ ہے خودی کے جوہر نمایاں ہونے کے لئے اور منازل ارتقا طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودی زماں و مکاں کی زنجیروں سے مقید اور علائق دنیاوی کی پابند نہ ہو بلکہ رضائے الٰہی پر چل کر جہاں آب و گل کو اپنا مسخر کرے۔ خودی کی ارتقا اس جہاں تک محدود نہیں بلکہ "ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

غرض مختلف منزلوں سے گذرنا اور مختلف جہانوں کو اپنے حسنِ کردار سے فتح کرنا ہے۔ اب اس نظریہ کی تفسیر ذرا اقبال کی زبان سے سنئے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک،

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر،
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیرِ مولیٰ جہاں اسکا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا،

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

(ساقی نامہ ۔ بال جبرئیل)

یہ تھا مختصراً اقبال کا فلسفۂ خودی۔ اسی فلسفہ سے وہ مسئلہ جہاد اخذ کرتے ہیں۔ خودی کے جوشِ کردار ہی کا دوسرا نام جہاد ہے۔ چنانچہ جہاد کے متعلق ہمیں اقبال کے یہاں بکثرت اشعار ملتے ہیں۔

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو | ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار
شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے | سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم | ہے وہ قوت کہ حریف اسکی نہیں عقل سلیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اسکی | کبھی شمشیر محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیم

ایک جگہ رومیؒ کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ | مصلحت در دیں عیسیٰ غار و کوہ

ایک جگہ مقام نبوت پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش | جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

شاید ان اشعار کو سنکر آپ پوچھیں کہ خودی اور اسکی مستی کردار کی نسبت فلسفیانہ گفتگو کرتے کرتے اقبال ایک کٹ ملّا کی طرح مذہبی جہاد کا وعظ کیوں دینے لگے۔

اس اعتراض کا جواب سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اقبال کے فلسفہ کے بعض اور اجزا پر غور کریں جنکے بغیر خودی کی تکمیل نہیں ہوئی اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت کیلئے چند چیزیں ضروری ہیں مثلاً عشق، عشق کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ | عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام،

ایک جگہ فرماتے ہیں

جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی | آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

عشق کے ساتھ فقر کو بھی وہ خودی کی تربیت کے لئے لازم قرار دیتے ہیں لیکن اقبال کا فقر بیکسی و بیچارگی کا ہم معنی نہیں۔ وہ فقر کی ان الفاظ میں تفسیر کرتے ہیں:۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست | ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است
فقر کافر خلوت دشت و دراست | فقر مومن لرزۂ بحر و بر است،

مرد حر کے فقر کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

پادشاہاں در قبا ہائے حریر　　زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

اب فلسفۂ خودی کو عشق اور فقر سے ملا کر دیکھئے۔ عشق خودی کے اندر حق کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ فقر خودی کو غیر حق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ دونوں میں صرف زاویۂ نگاہ کا فرق ہے ورنہ عشق بغیر فقر کے اور فقر بغیر عشق کے مکمل نہیں ہوتا۔ بہر حال ان دونوں اجزا کے مجموعہ کا نام توحید ہے۔ توحید ہی اقبال کے تمام فلسفۂ جہاد کی جان ہے دیوں سمجھئے کہ جہاد توحید کا عملی پہلو ہے:۔

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامۂ او کائنات،

ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون　　حرکت از لا زاید از الّا سکون

مومن جب لا الٰہ کہتا ہے تو یہ تمام باطل کے اصنام اور ناحق کی قوتوں کے خلاف اعلان جہاد ہے لیکن جہاد کا مفہوم اس تخریبی پہلو ہی تک محدود نہیں۔ لا الٰہ کہنے کے بعد الا اللہ کہنے سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ تخریب دراصل حق کی تعمیر کے لئے تھی۔ غرض جہاد کا مفہوم سمجھنے کے لئے "لا" اور "الّا" دونوں کی تفسیر ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کی نگاہ ایک ہی پہلو تک محدود رہ گئی تو اس نے جہاد کی حقیقت کو نہیں پایا۔ ایک شخص حق پر ایمان رکھتا ہے لیکن اپنی قوتوں کو باطل کے خلاف جنگ کرنے میں نہیں استعمال کرتا تو اس سے تعطل اور قوم کی موت کا سامان پیدا ہوتا ہے یہی غلطی جیسا کہ علامہ موصوف نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اکثر ہند اور ایران کے متصوفین نے کی۔ یعنی عشق الٰہی کے ساتھ انھوں نے صحیح فقر (یعنی غیر اللہ کی نفی) کی شان کو نہیں سمجھا۔

دوسری طرف اگر کوئی شخص صرف لا الٰہ پر رک جاتا ہے اور الّا کو نہیں مانتا تو اکثر اس کی قوتیں باطل کی حمایت اور ناحق کوشی میں صرف ہوتی ہیں۔ یہ بھی انسانیت کے لئے پیغام اجل ہے۔ اقبال روس سے اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

روس را قلب و جگر گردید خوں،　　از ضمیرش حرف لا آمد بروں

آں نظام کہنہ را برہم زد است　　تیز نیشے بر رگ عالم زد است

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ
فکر او در تند باد لا بماند — مرکب خود را سوئے الّا نراند
در مقام لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا ساز و برگِ اُمتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں

(یعنی اُس کا قلب اور جگر خون ہو گیا تو اس کے ضمیر سے 'لا' کی آواز بلند ہوئی اس کہنہ نظام کو اس نے درہم وبرہم کر ڈالا اور عالم کے نظم ونسق پر ایک کاری ضرب لگائی۔ میں نے اس کے حالات کا مطالعہ کیا تو پایا کہ وہ بادشاہت مذہب اور خدا سب کا منکر ہے۔ درحقیقت اس کا تخیل "لا" کی تیز آندھی میں پھنسا رہ گیا۔ اس نے اپنے مرکب کی باگ "الا" کی طرف نہیں موڑی۔ لیکن زندگی لا کے مقام پر ٹھہرتی نہیں۔ پھر کائنات آہستہ آہستہ الا کی طرف آتی ہے۔ لا اور الا دونوں قوموں کا ساز و برگ ہیں۔ لیکن نفی (لا) بغیر اثبات (الا) کے قوموں کے لئے پیغام اجل ہے)

مختصر یہ ہے کہ اقبال کا جہاد تمام تر مصلحانہ اور باطل اور ناحق کوشی کے خلاف ہے چونکہ فتنہ و فساد کی اصلاح اور سرکش طبیعتوں کی روک تھام بغیر قوت کے استعمال کے ممکن نہیں اس لئے انسانیت کی ہمدردی اور حق و انصاف کی حمایت میں قوت کو کام میں لانا ضروری ہے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم — عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حقیقتاً یہ اصلاحی جہاد امن عالم کیلئے ضروری اور اہل عالم کے لئے باعث صد برکت ہے۔ کوئی عملی مذہب یا معقول نظام اخلاق جہاد سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اقبال کی نئی شاہراہ

آفتاب احمد صاحب صدیقی (ردولوی)
متعلم بی۔اے آنرز

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

میں اِس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس رفیع الشان خدمت ادبی کے لئے اس دور میں ایسے بلند پایہ حضرات کا قحط نہیں جو مجھ سے کہیں بہتر طریقہ سے اِس فرض کو انجام دے سکیں۔ لیکن قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔

بہرحال اپنی متاع فرسودہ، تہی دامنی، اور کم مائگی کا اندازہ کرتے ہوئے بھی مستعد ہوگیا ہوں۔ خداوند قدوس کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ مناسب صورت میں اِس کا اتمام کرائے۔

اس دور کے اہل قلم حضرات کی یہ سنت جاریہ ہے کہ وہ کسی کے کلام کی عظمت و بزرگی، اُس کی خصوصیت اُس کی ہمہ گیری، اور اسکی جامعیت پر کچھ لکھنے کی صورت میں دور از کار اور غیر ضروری مباحث شامل کر دیا کرتے ہیں جس سے مقصود صرف اپنی "قوت انشار" اور "وسعتِ معلومات" کا بے محل مظاہرہ ہوتا ہے اور جو بسا اوقات اصل مقصود کی طرف ذرا بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ میں اپنی افتاد طبع سے مجبور ہوں۔ مجھے "غیر معصوم" اور "متکلفانہ" راہوں پر چلنا اور اپنے قلم کی جولانیاں دکھانا کبھی گوارا نہیں۔ میں ان غیر ضروری مباحث سے دور رہ کر اس وقت صرف وہی بیان کرونگا جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں یا جو مجھے بیان کرنا ہے۔

ریاضؔ کی خمریات، رواںؔ کی رباعیات، حالؔی کی کارآمد رقت پسندی، فانؔی کی حقایق نگاری جگر کا تڑپنے اور تڑپا دینے والا سوز و گداز، حسرؔت کا انوکھا اور اپنی نوعیت کا بالکل نیا مگر جاذب نظر طرز اور اصغرؔ کا معصوم و رنگا رنگ انداز بیان۔ بیشک یہی وہ آیتیں ہیں جن کی نبوت شاعری محتاج ہے۔ مگر اب میں ناظرین کی نظر التفات کو اُس شخص کے کارنامہائے نظم کی طرف مبذول کرنا چاہتا

ہوں جس نے ہمارے بے حس کاروانِ حیات میں اپنی بانگ درا سے ایک لرزش۔ ایک سیمابیت پیدا کی۔ جس نے بالِ جبریل، سے اُنھیں سوئے ہوؤں کو درس بیداری دیا اور پھر جس نے ضربِ کلیم، سے اُنکے محکوم سینوں پر ایک ضرب کاری لگا کر اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے ؎

خواب نوشین بامداد رحیل بازدارد پیادہ راز سبیل

آج اقبال شاعری کے اس دور میں ہے جس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگی۔ اُسکی دنیا الگ ہے اُسکے خیالات الگ ہیں اور اُسکے جذبات الگ۔ شاعری یا شعر کی سب سے بڑی تعریف یہ کیجاتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں بے حس و حرکت کر دے۔ اور ہمیں دنیا کی ہر شے سے بے نیاز بنا دے۔ یہاں تک کہ ہم اپنے وجود کو کم از کم تھوڑی دیر کے لئے بالکل فراموش کر دیں۔ مگر اقبال کی شاعری۔ یا شعر سے ہم پر بالکل مختلف اثر پڑتا ہے۔ اُس کے شعر کا ایک ایک حرف ہمارے جذبات کا محرک ہے، ایک ایک لفظ ہم میں احساس خودی پیدا کرتا ہے اور اس کا ایک ایک مصرع ہم جیسے لوگوں کے لئے جو محکومی کے زنداں میں پڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں پروانۂ رہائی لیکر آیا ہے۔ ہم سو رہے ہیں وہ ہمیں جگانا چاہتا ہے۔ ہم بزدل اور نکمے ہیں وہ ہم میں حرارت پیدا کر کے حرکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہم اپنی خودی کو فراموش کر بیٹھے ہیں وہ از سر نو ہمارے جسم میں خودی کی لہر دوڑا دینا چاہتا ہے۔

اقبال اور شعراء کی طرح طلسم الفاظ میں پھنسکر اپنے پیغام سے غافل نہیں ہوتا۔ اُس کا ارادہ مضبوط اور اٹل ہے۔ مثلاً معراج کے عنوان سے اس کی یہ نظم ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذّت پرواز کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکۂ باز پر سوز اگر ہو نفس سینۂ دراج
ناوک ہے مسلماں ہدف اُس کا ہے ثریا ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنیِ النجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

الفاظ کے اس گورکھ دہندے میں بھی وہ اپنے پیغام سے غافل نہیں۔ مسلمانوں کو عروج سے پستی

میں دیکھکر اُس کے دل میں ایک ٹھیس لگتی ہے اور وہ تلملاکر چیخ اُٹھتا ہے کہ ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کی عمل کا انداز　　　تھی نہاں جنکے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا　　　کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

کیا یہ دو شعر قوم کی حالت کا مرثیہ نہیں ہیں اور یقیناً ہیں مگر ان میں بھی ایک تعمیری شان مضمر ہے۔ کیا وہ غیرت دلا دلاکر ہمیں ابھار نہیں رہا ہے۔ کیا اِن سے اُسکی مجروح روح کا نقشہ نگاہوں کے سامنے نہیں آجاتا۔ کیا یہ اُس کے دکھے ہوئے دل کے ترجمان نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سینہ کوبی کی آن اور گریہ وزاری کی شان نہیں۔ رونا اور ماتم کرنا اُس کے مذہب میں بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ وہ رو روکر اور رُلا رُلاکر قوم کو اور زیادہ نکما نہیں بنانا چاہتا۔

زندگی کا مقصد اقبال کے نزدیک خودی۔ خودنگری۔ خودپرستی۔ خودشماری اور خودداری ہے۔ جس کے ثبوت کے لئے اس کے یہ اشعار کافی ہیں ؎

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی　　　وہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر، خودی　　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

روح اسلام کی ہے نور خودی نار خودی　　　زندگانی کے لئے نار خودی، نور حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصلِ نمود،　　　گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اُسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر　　　دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

اقبال اگر ایک طرف ہمارے درخشاں ماضی کی داستان بیان کرتا ہے ہم کو ہماری پرانی عظمت اور کھوئی ہوئی بزرگی کی یاد دلاتا ہے اور ہمارے حال کی ذلت وخواری کا دلشکن خاکہ دکھا دکھاکر ہمیں شرم و غیرت دلاتا ہے تو دوسری طرف ہمارے سنہرے مستقبل کی پیشین گوئی کرکے ہمیں ناامیدی کی مایوسیوں سے باز رکھتا ہے۔ اُسکے یہ دو مصرعے ہمارے اس دعوی کی تسلی بخش تفصیل پیش کر رہے ہیں ؎

کھا گئی روح فرنگی کو ہوائے زر و سیم | اب ترا دور بھی آنیکو ہے اے فقرِ غیور

اقبال نے جہاں ہماری روز افزوں جمود و بے حسی۔ بے غیرتی اور بے ہمتی کا رونا رو کر ہمارے دلوں میں ایک ٹیس پیدا کر رکھی ہے وہاں اُس نے موجودہ صوفی و ملا، فقیہ و شاعر، اور زاہد و مومن کو بھی بغیر عریاں کئے نہ چھوڑا بھی نہیں بلکہ اُن کی عریانیوں کو منظر عام پر لا کر ہمیں عبرت حاصل کرنے کا بھی موقع دیا ہے ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے رونق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

آج کل کے نوجوانوں کے سامنے ہمارے دیگر شعراء حضرات نے اپنے جو خیالات پیش کئے ہیں یا کرتے ہیں وہ یا تو زلف و گیسو، میت و جنازہ۔ شمع تربت اور گور غریباں تک محدود ہیں یا پھر انھوں نے معشوق کے ناز و غمزے، بناؤ سنگار، اور اُس کے جوبن پر اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ ؎

تاروں کے ٹوٹنے کی ادا اُن کو بھا گئی
افشاں لگا لگا کے چھڑائی تمام رات

کوئی فرماتا ہے ؎

شمع نے آگ دھری سر پہ قسم کھانے کو
بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

کوئی صاحب۔ نی ۔ دھا۔ پا۔ گا۔ رے۔ سا کا لحاظ رکھتے ہوئے چیخ اُٹھتے ہیں ؎

تیری جفا قبول مگر یہ رہے خیال
ہم پھر نہ مل سکیں گے اگر ہم نہیں رہے

کوئی سلاسل ہجر میں مبتلا ہے تو کوئی سلما کی زلفِ گرہ گیر میں پھنس کر قلا بازیاں کھا رہا ہے۔ کوئی ہجر میں آنسو بہا رہا ہے تو کوئی وصال کی اُمید موہوم کے سہارے زندگی کے تلخ لمحوں کو گذارنے کی کوشش میں ہمہ تن جد و جہد ہے۔ پوچھئے کہ آخر اس دردسری سے اُنھیں کیا فائدہ ہوا اور کیا ملک و قوم نے اُس سے نصیحت حاصل کی۔ (یہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں عاشقی کرنا آجاتا ہے۔ ہائے ہائے سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں اور ٹھنڈی سانسوں میں اُنھیں ایک خاص قسم کی لذّت محسوس ہونے لگتی ہے) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گنے چنے حضرات بھی سراندا ختم، کہہ اُٹھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن سے مادرِ قوم و ملّت کو کچھ نہ کچھ توقع ضرور تھی۔

برخلاف اس کے اقبال جو اپنے دل و دماغ کی متاع اُن کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

وہ یہ ہے ؎

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جسکے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے، تو عالمِ آزاد

موجوں کی تپش کیا ہے فقط جوشِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

اقبال ایک ایک طرح سے نہیں بلکہ ہزار ہزار طرح سے نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اُن میں جوشِ عمل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُنکی مردہ دلی کو زندہ دلی میں بدلنے کے لئے ہمہ تن جد و جہد ہے وہ نوجوانوں کو نئے نئے راستوں سے گھما گھما کر پھر اُسی قصر میں لے آتا ہے جہاں پہونچکر اُنھیں حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔ جہاں وہ اپنی تباہیوں کو بہ نظرِ خود دیکھکر جوش و غصّہ سے بیتاب ہو جائیں

اور اُن کی رگوں میں خوں عمل دوڑنے لگے۔ اور اُن میں از سرِنو ایک ولولۂ حیات پیدا ہو جائے۔ اقبال نے کس انوکھے انداز سے اپنی اس نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں انھیں غیرت دلائی ہے کہ سبحان اللہ ؎

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو اُنکے کوہ و دمن سے نکال دو

اہلِ حرم سے اُنکی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ایک جگہ اقبال نے ہماری بے کسی اور بے بسی۔ ہماری پریشاں حالی۔ ہماری بڑھتی ہوئی کمزوری اور ہماری ذہنی پستی کا خاکہ کچھ ایسے دردبھرے انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس سے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ ہم سے گلہ طراز ہے کہ ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اقبال کا مقصد کیا ہے۔ اُس کی نظروں میں زندگی کا مفہوم کیا ہے۔ وہ ہم میں کونسی تبدیلی دیکھنے کا آرزومند ہے۔ وہ ہمیں کیا ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ مغرب نے ہم پر کون سا اثر ڈالا ہے۔ ہم کیوں دل شکستہ ہو گئے ہیں۔ کیوں ہم میں وہ جرأت۔ وہ عزم و استقلال نہیں رہا جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف کبھی حکومت کر چکے ہیں یہ سب اُن کی اس نظم سے صاف ظاہر ہے ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے اُنکو سبق خود شکنی، خودنگری کا
تو اُن کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا اُنھیں فنِ شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ اُنکی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں میں جوشِ جنوں میں ترے اسرار — مجھکو بھی صلا دے مرے آشفتہ سری کا

بخوفِ طوالت میں فی الحال اس مضمون کو اسی جگہ ختم کیے دیتا ہوں۔"

اقبال اور اردو غزل

از قمر الدین خاں صاحب متعلم ایم۔ اے
ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (انگریزی)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

کہا جاتا ہے کہ اُردو غزل گوئی کا دور ختم ہو گیا، نہ تو اب اس کے لئے مواد میسّر ہے اور نہ ایسی شاعری زمانے کو درکار ہے بعض ترقی پسند اصحاب تو یہ کہنے پر اتر آئے ہیں کہ غزل کی آیندہ افزائش سے اُردو ادب و اُردو شاعری خطرے میں ہے، یہ شبہات اور یہ محاکمے عوام کو کتنے ہی بے معنی اور مضحکہ خیز کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں کچھ تو اصلیت ضرور رکھتے ہیں، اس مسئلہ پر ہمارے ہمعصر اُردو رسائل و اخبارات وقتاً فوقتاً تنقید و تبصرہ کرتے رہتے ہیں لہذا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ صرف اس بنا پر مضمون ہذا کو خواہ مخواہ طوالت دیجائے تاہم یہ بتلانا ضروری ہے کہ آخر اس نکتے کا اس مقام پر کیوں تذکرہ کیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ نہ تو اُردو میں شعراء کی کبھی کمی رہی ہے اور نہ انشاء اللہ اس کی کبھی اُمید کی جا سکتی ہے، اردو طبقے میں کچھ نہیں تو پچاس فیصدی شاعر ضرور ہونگے باقی پچاس فیصدی بھی اگر وہ عبارت صحیح طور پر پڑھ سکتے ہیں تو شعر گوئی کے ذوق سے محروم نہ ہونگے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کو قافیہ اور ردیف کی جستجو میں سر کھپانا پڑتا ہو یا بادامی کاغذ پر چھپے ہوئے پرانے خستہ دواوین کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہو، ملک میں چھوٹے بڑے اُردو کے ہزاروں رسائل شائع ہوتے ہیں، ان کی خاص زینت یہی غزلیں ہوتی ہیں، ان غزلوں کو پڑھتے وقت چند منٹ کے لئے ہم ایک اجنبی اور غیر فطری دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں، چند لمحوں کے لئے دماغ میں پریشان اور مصنوعی تخیلات کا ہجوم ہو جاتا ہے (اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دل ان چیزوں سے بسا اوقات نا آشنا رہتا ہے) بہت جلد یہ کیف محو ہو جاتا ہے اور پھر یہ یاد نہیں رہتا کہ کیا پڑھا اور کس کا کلام تھا، کبھی کبھی انھیں تاریکیوں میں نور کی جھلک نظر آجاتی ہے اور ہم نہایت مشتاقانہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں، "حسرتؔ" "فانیؔ" "جگرؔ" "اصغرؔ" وغیرہ وغیرہ، بہر حال یہ جگمگاہٹ بھی دیرپا نہیں ہوتی، تھوڑا سا محظوظ ہو کر ہم سوچنے لگتے ہیں

"کیوں! کیا میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ میں یہ باتیں نہ تھیں۔ بیشک تھیں"۔ چنانچہ ہم اِن چند نئے معیاری شعراء کی طرف بھی سچے دل سے ملتفت نہیں ہوتے، پھر ایسے ماحول میں، ایسی آب و ہوا میں کسی غزل گو شاعر کو اگر خاص طور پر اہمیت دیجائے تو اِس مخصوص توجہ کی توجیہہ ضروری ہے، ذیل کی سطور اسی روش میں لکھی گئی ہیں۔

یوں تو اقبالؔ کو شعرائے عالم کی صف اول میں جگہ ملتی ہے، اور وہ اس صف کے مقتدی نہیں بلکہ اس کی امامت کے حقداروں میں سے ہے، لیکن فی الوقت، ہم کو اپنے شاعر کی ایک خاص صنف کلام سے بحث ہے، قریب حال تک اقبال کی پرستش ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے ہوتی تھی اور خدانخواستہ اگر اقبالؔ کی اُردو شاعری کی تمام کائنات بانگ درا ہی ہوتی تو شاید اس حقیقت پر کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ ہوتا، مگر بالِ جبریل اور ضرب کلیم کی اشاعت سے اُردو غزل میں جو انقلاب ہوا ہے اس کو نہ تو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ ہماری آئندہ نسلیں۔

بانگ درا کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے، شاعر کے دوران زندگی کے مطابق کتاب تین حصوں پر منقسم ہے، ہر حصّہ کے اختتام پر چند غزلیں بطور شیرینی کے اضافہ کر دی گئی ہیں، آئیے پہلے ہم مختصر طور پر انھیں غزلوں کا جائزہ لیں اور معلوم کریں کہ ان میں اور دیگر شعرائے ماضی و حال کی غزلوں میں کیا فرق ہے، کیا ان میں کوئی انفرادیت ہے اور ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔

بادی النظر میں تو کوئی ایسا فرق نہیں معلوم ہوتا حُسن محبوب کی سحر کاریاں تپش شوق، معشوق کے تغافل کا شکوہ، ہجر کی دلگدازیاں، رقابت کی مار، عہد بندیاں اور وعدہ خلافیاں، کلیم و طور، واعظ کی مذمت، صیاد و آشیانے کی سرگزشت، بجلی کا قفس پر گرنا، فلک کا ظلم بے بنیاد، حوادث زمانہ، ہستی فانی، غرضیکہ وہ تمام مضامین اقبال کے یہاں موجود ہیں جن سے ہمارے بزرگوں کے بے شمار دیوان بھرے پڑے ہیں، مثلاً:۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائدار دیکھ

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

ہم اپنی دردمندی کا فسانہ
سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کیلئے
بجلیاں بیتاب ہیں جنکو جلانے کیلئے

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کیلئے

پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اڑ کے جاتا ایک دانے کیلئے

جائے حیرت ہے برا سارے زمانہ کا ہوں میں
مجھکو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

مگر اس دور کے کلام میں بھی بعض ایسے نکتے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر ایک سطحی نظر بھی پھڑک اٹھتی ہے، سب سے پہلی چیز زبان کی انفرادیت بلکہ اس کا انوکھاپن ہے، نفسِ مضمون سے بحث

نہیں شاعر کے الفاظ و محاورات غزل کی رسمی پابندیوں سے بہت زیادہ آزاد معلوم ہوتے ہیں، اتنا اندازہ تو ہر شخص کو ہو جاتا ہے کہ اقبال کے پیشروؤں یا اس کے ہمعصروں میں سے غزل کے لئے ایسی زبان کبھی کسی نے استعمال نہ کی۔ مثلاً۔

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل — یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حُسن — دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے — ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

مجھے روکے گا اے ناخدا کیا غرق ہونے سے — کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا — جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

---

(۲) اب تک اُردو غزل کے دامن میں سوائے چند عشقیہ مضامین کے اور کچھ نہ تھا، اسی وجہ سے غزل کی ایک مخصوص زبان بن گئی تھی، اُردو غزلوں میں فسانۂ عشق کے علاوہ بھی چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن ان کا مفہوم بھی صرف ان منتخب الفاظ و محاورات سے ہی ادا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ غالبؔ اس نظریئے کی کس لطیف پیرائے میں مدافعت کرتا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہر حال یہ نظریہ کسی طور پر صحیح نہیں، یہی چیز تھی جس کے خلاف اول اول حالیؔ نے علم احتجاج بلند کیا، ایک عرصے تک اُردو پبلک حالیؔ کو پاگل اور سر پھرا کہتی رہی، مگر خوش قسمتی سے حالیؔ

کو اقبالؔ اور حسرتؔ جیسے پیروکار ان کی زندگی ہی میں میسر آ گئے، اقبال کی ان تمام غزلوں میں جو بانگ درا میں ملتی ہیں عشقیہ مضامین برائے نام ہیں، بعض بعض غزلیں تو پوری کی پوری سیاسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، مثلاً،

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

---

(۳) سیاسیات کے مسائل سے تو اقبال کا تمام کلام بھرا پڑا ہے، لیکن ہمارا شاعر محض سیاسی پیغامبر ہی نہیں بلکہ مصلحِ قوم و ملت اور ایشائی تہذیب کا بہت بڑا حامی اور پرستار ہے، مغرب کے تمدن کو وہ ان الفاظ میں یاد کرتا ہے ؎

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یورپ اور امریکہ کے حسن اور عریانی پر آج ایک دنیا جان دیتی ہے لیکن شاعرِ مشرق کا تجربہ ہے ؎

میں نے اے اقبالؔ! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

مغرب کی تقلید کو اقبال مشرق کی قوموں کے حق میں سمِ قاتل سمجھتا ہے ؎

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مۓ مغرب اثر　　خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھائے　　ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

(۴) پہلے ہمارے شعرا یہ اپنا عین فرض سمجھتے تھے کہ شیخ و محتسب اور زاہد و عابد کو خواہ مخواہ برا بھلا کہا جائے، رندانہ اور لاابالی زندگی کو ہمیشہ پرہیز گاری کی زندگی پر ترجیح دی جاتی تھی۔ حالی نے اس نامعقول روش کے خلاف بہت آواز اٹھائی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی آواز ویرانے میں صدائے بازگشت ہو کر رہ گئی، اِس دور کے غزل گو شعرا نے حالی کی اصلاح کو نہایت بے التفاتی سے ٹھکرایا ہے، اقبال نے اِس اصلاح پر پورا پورا عمل کیا ہے، اقبال نے جب کبھی بھی واعظ قوم کو مخاطب کیا ہے تو خود ریفارمر اور قومی رہنما کی حیثیت اختیار کی ہے اس کا مقصد محض عالموں اور مذہبی پیشواؤں کو جھٹلانا نہیں ہوتا۔ وہ اس جماعت کی کمزوریوں کا پول کھول دیتا ہے ؎

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب!　　عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں　　لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!

اُمید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو　　یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ　　خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

ہمارے علما کی آجکل یہ عام روش ہے کہ بات بات پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کو اس کا حق حاصل ہے کہ عوام الناس کو جو چاہیں کہیں، مردود، بدعتی، ناری وغیرہ ایسے الفاظ تو ہر وقت ان کی زبان پر ہوتے ہیں۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

لیکن اپنے صوفیائے کرام اور بزرگان دین کا جیسا احترام اقبال نے کیا ہے دیگر شعرا کو شاید ہی یہ توفیق عطا ہوئی ہے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ انکو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں،

جنگ عظیم سے قبل کی غزلوں میں خیالات کا تنوع اتنا زیادہ نہیں ہے، اس وقت تک اقبال زیادہ تر نظم گو شاعر رہا ہے، نظمیں عموماً سیاسی، قومی اور اصلاحی تھیں، اقبال کا مقصد حیات مسلمانوں کو بالخصوص اور ایشائی اقوام کو بالعموم دوبارہ زندہ کرنا اور ان کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا ہے، اقبال کی ساری شاعری اس مقصد کی ترجمان ہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے شروع شروع میں شاعر غزل گوئی پر نہیں مجبور تھا، یہی وجہ ہے کہ بانگ درا میں اتنی تھوڑی غزلیں ہیں، اور یہ غزلیں بھی تمام تر نظموں کے رنگ میں لکھی گئی ہیں، اس کتاب کو دیکھکر صاف پتہ چلتا ہے کہ آیندہ اگر اقبال نے اُردو غزل کے "گیسو" سنوارنے کی طرف توجہ کی تو اُردو ادب کا شانہ قیامت تک شاعر کے احسان سے ہلکا نہ ہوگا۔

(۵) بانگ درا کی غزلوں میں ایک اور بہت بڑی خصوصیت پائی جاتی ہے جو بعد میں بال جبریل کی خاص زینت ہوئی — غزل میں اب تک تسلسل تخیل جائز نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ بعض شعرائے متقدمین جیسے مہر[1] اور غالب غزل لکھتے لکھتے اس میں چند اشعار کا ایک قطعہ اضافہ کر دیا کرتے تھے یا قطعات لکھتے تھے جن میں غزل کی خوبیاں موجود ہوتی تھیں، بہرحال یہ طرز نہ تو عام ہو سکی اور نہ عام طور پر اس میں کسی کو کامیابی ہوتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ غزل کا سب

---

[1] (نوٹ) ہمیں فاضل مضمون نگار سے اتفاق نہیں۔ متقدمین کے دواوین میں اکثر مسلسل غزلیں موجود ہیں۔ (مدیر)

ے بڑا عیب اشعار کی اندرونی بیگانگی ہے، اور چونکہ اُردو شاعری میں یہ صنف کلام بہت زیادہ مقبول ہے لہذا اس عیب نے ہماری شاعری کو سب سے زیادہ خراب کیا ہے، بقول حالی جب ہمارے شعرا غزل کہنے بیٹھتے ہیں تو پہلے قافیہ اور ردیف تلاش کرتے ہیں اور پھر اس شکنجے میں جو خیال پھنس سکا اسے پھانس دیا اور یونہی اندھا دھند لکھتے چلے جاتے ہیں، بانگ درا میں طرز مذکور کی بھی نہایت عمدہ غزلیں ملتی ہیں، مثلاً،

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی ۔۔۔ مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا ۔۔۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا، ۔۔۔ سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سُنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خاموشی نے آخر ۔۔۔ جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

اس تمہید کے بعد اب میں بال جبریل کی غزلوں پر مفصل بحث کروں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ غزل گوئی کے اعتبار سے شعرائے اُردو میں اقبال کی کیا وقعت ہے۔

بال جبریل کی غزلیں دو حصوں پر منقسم ہیں۔ حصہ اول میں سولہ غزلیں ہیں ان کا موضوع عشق الٰہی ہے، انسان نہایت آزادی وبیباکی سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتا ہے، یہ انسان ایک مکمل مسلمان ہے جو اپنے مالک سے کبھی تو شکوہ کرتا ہے، کبھی اس سے شوخی کرتا ہے، کبھی مختلف قسم کے بے باکانہ سوال پوچھتا ہے، کبھی اپنی ہستی پر ناز کرتا ہے۔ غرضکہ اس ایک موضوع میں صدہا دیگر مضامین شامل ہیں، لیکن آپس میں اس طرح جذب ہو گئے ہیں گویا کثرت میں وحدت سما گئی ہے۔ ہاں! اس مقام پر یہ کہدینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ یہ غزلیں نہ محض اُردو زبان میں

بلکہ مشرقی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ فارسی شاعری اپنی وسعت و عظمت پر جتنا جی چاہے ناز کرے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہاں بھی ان غزلوں کے نمونے خال خال ہی نظر آتے ہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صوفیانہ شاعری بالکل دیگر چیز ہے، اس کو اقبال کے اس طرز سے لگاؤ تک نہیں،

معشوق حقیقی جس طرح اقبال خود عام انسانوں سے بہت زیادہ بلند ہے اس نے اپنا معشوق بھی ایک ایسی ہستی کو انتخاب کیا ہے جو حسن مکمل یعنی خود اللہ تعالیٰ ہے جس کا حسن پائدار اور جس کا جمال لازوال ہے، اقبال عشق مجازی کا قائل نہیں کیونکہ اس میں بہت سے خطرے ہیں، وہ چند روزہ ہے، اس کا دوام اس کی بقا عارضی ہے ؎

وہ عشق جسکی شمع بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

لیکن عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اقبال کو اس انتخاب میں ڈر بھی معلوم ہوتا ہے، کہیں اس کی بیباکی اور جسارت گستاخی نہ سمجھی جائے، چنانچہ وہ اپنے محبوب کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے اُلجھنا شرار کا

ابتدائے عشق عاشق التجا کرتا ہے کہ میرا عشق بالکل نرالا ہے شاید میں دید کی تاب نہ لاسکوں لہٰذا ابھی تو بے نقاب ہوکر اپنا حُسن نہ دکھا ؎

میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ   کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے ؎

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو   مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

پھر معشوق کی طول بے التفاتی سے گھبرا کر اقبال پکار اُٹھتا ہے ؎

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ   وہ ادب گہ محبت وہ گلہ کا تازیانہ

پھر کہتا ہے کہ یہ تمام کائنات اور یہ کل مخلوقات تو نے میرے ہی خاک وخون سے پیدا کی ہے اس کا کچھ تو صلہ دے، میں کونسے ایسے جرم کا مرتکب ہوں جو مجھ سے اتنی دوری برتتا ہے ؎

مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا   صلہ شہید کیا ہے؟ تب وتاب جاودانہ!

اور باوجود میری کوششوں کے باوجود تری مدح سرائیوں کے ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی   مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال بے نوازی

میں اب تک نہیں سمجھا کہ میں کسی الجھن میں پڑ گیا ہوں کہاں ڈال دیا گیا ہوں، اور نہیں معلوم یہ میرا اپنا گھر ہے یا میں تیرے کرشمے میں اسیر ہو گیا ہوں ؎

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟   یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں   کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

میرا تو یہ حال ہے اور تجھکو پروا تک نہیں، میرے نالوں سے، میری آہ وفغاں سے تیرا حرم گونج اٹھتا ہے میری نگاہیں ہمیشہ عرش پر ہی رہتی ہیں، اور اگرچہ میں اس کشمکش میں پڑا ہوا ہوں میرے دل کی آواز سچی اور دردناک ہے ؎

گرچہ ہے میری جستجو دیر وحرم کی نقشبند   میری فغاں سے رستخیز کعبہ وسومنات میں

لیکن ہائے! تو نے اپنی بے التفاتی اور اپنے تغافل سے میرے عشق کا راز فاش کر دیا ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھکو بھی فاش کر دیا   میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

عاشق کو یقین کامل تھا کہ اس کا عشق سچا تھا مگر روز محشر سوال وجواب شروع ہوا تو یہ بھی بلایا گیا اس کو اپنے فعل پر سخت ندامت ہوئی اور وہ بہت پشیماں ہو کر کہتا ہے ؎

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی   داور محشر کو اپنا راز داں سمجھا تھا میں

اب وہ ہر طرح سے بیزار ہو کر بہت ادب سے شان محبوبی میں التجا کرتا ہے ؎

رگِ تاک منتظر ہے تری بارش کرم کی ‏ ‏ ‏ کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مے مغانہ

پھر سے گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ‏ ‏ ‏ ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اگر تو پردے میں رہنا چاہتا ہے تو رہ مگر

ع یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

میں ایک بہت چھوٹی سی چیز ہوں لیکن کاش تو اپنی وسعت میں اس ذرے کو سمولیتا ؎

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو ‏ ‏ ‏ یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

انتہائے شوق | عشق الٰہی میں شاعر اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ تمام بندشوں سے اپنے کو آزاد سمجھنے لگتا ہے، اس آزادی کے عالم میں اقبال کی زبان سے جو اشعار نکلے ہیں ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک دریائے معانی اور شعریت کا کمال ہے، مضمون کی طوالت کے ڈر سے میں صرف چند مثالیں پیش کروں گا۔

اُردو غزل میں ہجر اور معشوق کے مظالم کے مضامین بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن اقبال کو ان فرسودہ اور لغو مضامین سے نفرت ہے اس کا محبوب قہار، ستمگار، ظالم اور قصائی نہیں، وہ اس کا دوست اور حبیب ہے، وہ اس سے دور رہ کر ہجر کا رونا نہیں روتا، وہ بزم یار میں پہنچ کر بے تکلف ہو جاتا ہے اور بہت جلد صاحب محفل کا رازداں بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی کیف میں آکر کہتا ہے ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی ‏ ‏ ‏ یاد آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

ایک دوسرے مقام پر شراب معرفت سے مدہوش ہو کر کس مزے سے کہا ہے ؎

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو ‏ ‏ ‏ پلا کے مجھ کو مے لا الٰہ الا ہو

ان غزلوں کی ایک بہت بڑی صفت شوخی ہے، اُردو کی عام غزلوں میں بھی ناز و نیاز کے جھگڑے بہت پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات بہت دلچسپ ہوتے ہیں، مگر اقبال کے یہاں یہی چیزیں کچھ اور ہی رنگ و صورت اختیار کر لیتی ہیں، اقبال کا خیال ہے کہ

بندہ اپنے مالک سے جتنی بھی شوخی کرے جتنا بھی ناز کرے کم ہے اور بجا ہے۔

شاعر ایک لمحہ کے لئے دنیا کی گمراہیوں اور بے اصولیوں سے متنفر ہو کر اس خیال میں محو ہو جاتا ہے کہ آخر کائنات عالم میں باوجود آئین قدرت کی مستحکم حکومت کے یہ بے عنوانیاں کیوں ہیں لیکن وہ فوراً سنبھل جاتا ہے اور خدا کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

مجھے یقین نہیں کہ آج تک دنیا کے کسی شاعر کو اتنی جرات ہوئی ہو جس نے اللہ تعالیٰ کو ان الفاظ میں یاد کیا ہو، یوں زبان تو ہر شخص کے منہ میں موجود ہے، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کہے لیکن شاعر کا وجود عوام الناس سے مختلف ہوتا ہے، وہ ایک ایسی بات جس کو ہم صریحاً ناجائز اور مخرب اخلاق سمجھتے ہیں شعریت کے جامے میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں، اس کے عیب کو مستحسن خیال کرنے لگتے ہیں اور اس کی گستاخی کو شوخیٔ ادا سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان اپنی نافرمانی کی بدولت جنّت سے نکالا گیا، وہ دنیا میں آیا تو اپنے ساتھ ساتھ مصیبت و مشقت لایا، اس کے علاوہ اس کے جرم کو یاد دلانے کے لئے موت ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہی، ہمارا شاعر اس واقعہ کو دوسری روشنی میں دیکھتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ البتہ میں نے قصور کیا جس کی پاداش میں جنّت سے نکالا گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ ہوا کہ تیری جنّت اب تک ویران پڑی ہوئی ہے اس لطیف خیال کو شاعر کس حسن و خوبی سے ادا کرتا ہے ؎

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اور پھر کہتا ہے ؎

باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یعنی جب تو نے ایک مرتبہ مجھ کو نکال دیا تو پھر کیوں بلاتا ہے، دنیا میں مجھکو بہت سے کام کرنے ہیں، جب فرصت ملے گی تو آؤنگا، یہ جلدی کیوں ہے یعنی موت وقت بے وقت کیوں آ دھمکتی ہے؟

دنیا کی بوقلمونیاں، بزم قدرت کی رنگ آرائیاں، فطرت کے عجائبات اور یہ کل کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کیا، یہ سب چیزیں اسی کے زیرنگیں ہیں، اسی کے استفادہ کے لئے ہیں، لہٰذا انسان کو ان بے بہا نعمتوں کے صلہ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکریہ ادا کرنا چاہیئے، مگر آپ سنئے کہ ہمارا شاعر جدت طراز کیسے شکریہ ادا کرتا ہے ؎

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

شوخی کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑدی پرہیز

اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی،

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزلخوانی

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

حصہ اول کی غزلوں کی جو سب سے بڑی خوبی تھی میں نے بیان کردی اس سلسلے میں ایک بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ اگر غزل کا خاص موضوع ہم عشقیہ مضامین ہی رکھیں تو اس میں بڑی وسعت پیدا کی جاسکتی ہے، عشق مجازی (جو کہ ہمارے شعرا میں عموماً بناوٹ اور تکلف سے

سوا کچھ نہیں ہوتا) کے ساتھ اگر عشق حقیقی کو بھی غزل میں شامل کر لیا جائے تو اُردو کا دامن بہت دولتمند اور پاک ہو سکتا ہے، اس نئے مضمون کو اقبال نے جس حسن و خوبی سے باندھا ہے وہ شاید ہمیشہ کے لئے اپنی مثال آپ رہے، بہر حال آرٹ اور شاعری کی روشنی میں یہ اشعار نہ محض ایڈیل ہیں بلکہ ادب عالم میں ان کو بہت بڑی جگہ ملتی ہے۔

اس حصے کی اور خصوصیات آگے آئیں گی۔

حصہ دوم میں اکسٹھ غزلیں ہیں، دونوں حصوں کی اکثر غزلوں میں خیالات مسلسل ہیں لیکن ان میں غزل کی سب ضروریات موجود ہیں اسلئے ان کو نظم نہیں کہہ سکتے۔ حصوں کے پہلے حصے ہیں میں نے اشارہ کیا تھا کہ اقبال نے اپنی غزلوں میں عشقیہ مضامین کو بہت کم جگہ دی ہے، بال جبریل کی بیشتر غزلیں زمانہ حال کی بہترین ترجمان ہیں، غیر ممالک کے ادبیات اُٹھا کر دیکھ لیجئے ہر زمانے کے شاعر یا مصنف کی تصنیف اس کے عہد کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہوئی ہے، اُردو نثر خواہ جیسی بھی ہو بہر حال اُردو شاعری کے کان تو اس چیز سے کبھی آشنا تک نہیں ہوئے آج ہم میر، غالب، داغ، انیس، دبیر کا کلام پڑھیں اور پھر پتہ لگائیں کہ یہ لوگ ہندوستان کی تاریخ میں کب گذرے تھے تو بھلا کیا پتہ چل سکتا ہے، ہمارا رہنما صرف اُردو کی فلولوجی ہو سکتی ہے، اُردو کے موجودہ شعرا میں سے بہت کم اس عیب سے بری ہو سکتے ہیں، یہ چیز پہلے پہل سرزمین ہند میں صحیح معنوں میں اقبال ہی کی شاعری میں آئی، اول اول تو اس نے نظم کا جامہ پہنا، مگر جب شاعر کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہو گیا تو اس نے اُردو غزل کو بھی نظم کے مضامین سے آراستہ کیا، یہ کام اپنی جگہ پر بیشک بہت مشکل ہے لیکن ہم ابھی دیکھیں گے کہ اقبال کی یہ "نظمی غزلیں" دنیائے شاعری میں

لہ فاضل مضمون نگار نے اگر میر اور دیگر شعراء کے ماحول کا مطالعہ کیا ہے تو وہ یقیناً محسوس کرینگے کہ یہ شاعر کس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا میر کی الم پرستی اور قنوطیت سے اس عہد کے تاریخی ماحول کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ (مدیر)

کہاں تک کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔

بال جبریل کی غزلوں میں جیسا کہ میں نے قبل تذکرہ کیا زمانہ حال کے ہر پہلو پر شاعرانہ و فلسفیانہ تبصرہ موجود ہے، تاہم بعض مضامین جن پر شاعر نے خاص طور پر زور دیا ہے اور جن کا بار بار اعادہ کیا ہے ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

مسلمان اور اسلام ضربِ کلیم کے ایک باب کا بعینہٖ یہی عنوان ہے، بال جبریل میں یہ نفس شروع سے اخیر تک پیوستہ ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کی کل شاعری کو اسی عنوان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس مقام پر ہمارا زاویہ نظر مصلحتاً محدود ہونا چاہیئے۔

کتاب کے صفحہ اول ہی پر یہ شعر درج ہے ؎

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں ۔۔۔ نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں

مسلمان کو ہر قسم کی تعلیم دی گئی ہے جن میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں:۔

فقر گذشتہ آٹھ یا دس سال کے کلام میں اقبال نے اپنے کو قلندر کے نام سے یاد کیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب شاعر محض شاعر نہیں رہا بلکہ دنیائے اسلام کا فی زمانہ سب سے بڑا فلسفی تمدن اسلامی کا ایک بہت بڑا حامی و محافظ تاریخ اسلام کا ایک مایہ ناز مورخ، اسلامیات کا ایک بہت بڑا عالم اور دورِ حاضرہ کا ایک پرمغز سیاسی مدبر۔ ابتدائے اسلام میں یہ خوبیاں ہمارے لیڈروں اور ہمارے اماموں ہوا کرتی تھیں، وہ نہایت سیدھے سادے مسلمان اور اللہ کے نیک بندے ہوتے تھے، انھیں بزرگوں کو اقبال نے اپنا نمونہ بنایا اور اسی اعتبار سے اسنے قلندری اختیار کی۔

فقر کے معنی فاقہ مستی نہیں، فقر کے معنی ہیں قناعت، استقلال، سادگی، میانہ روی، فقر کے معنی ہیں اسلامی روایات پر نہایت سختی سے پابند ہونا، فقر میں مستی ہے جلال ہے جمال ہے فقر میں قلندری ہے اور فقر میں سکندری ہے، در اصل اس لفظ کی تعریف مشکل ہے، بہر حال اقبال

نے فقر کے جو معنی لئے ہیں وہ میں نے مختصراً بیان کر دئے۔ ذیل کے اشعار اس پر اور روشنی ڈالیں گے۔
فقر اپنی چھوٹی سی دنیا میں چین سے زندگی بسر کرتا ہے مگر اس کی نگاہ بہت تیز ہیں اور کاشف الاسرار ہوتی ہے، اس کو گدڑی میں لعل نظر آتے ہیں، وہ گدائی میں بادشاہت کے رموز پہچانتا ہے؎

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی

درحقیقت فقر و بادشاہت میں کوئی اصولی فرق نہیں ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی!

فقیر مست اور آزاد ہوتا ہے ؎

درویش خدامست، نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

فقیر کے لئے لازم ہے کہ اس میں شاہانہ جلال و جمال ہو، وہ قوموں کا سردار ہو، وہ حاکم ہو؎

گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنت پرویز

آج کل فقیر و صوفی خانقاہوں میں بیٹھے اللہ ہو، اللہ ہو، کیا کرتے ہیں، وہ دنیا کو دھوکا دیتے اور اپنے ضمیر کو جھٹلاتے ہیں، نہ تو ان کے ہائے وہو میں کچھ اثر ہوتا ہے اور نہ ان کی نگاہ میں کوئی شوکت و جلال؛ حالانکہ یہ چیزیں اس کی خاص جوہر ہیں ؎

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز
نہ تخت و تاج میں ہے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

فقیر مال و دولت کا مالک نہیں ہوتا ؎

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہ شہر ہے قاروں لغت ہائے حجازی کا

فقیر کی نگاہ بہت بلند اور خود بیں ہوتی ہے، اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی خوف سے لرزہ براندام ہوتی ہے ؎

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

فقر کی ایک اعلیٰ مثال حضرت علی کرم اللہ وجہ ہیں، جس شخص میں آپ کی فقیرانہ ادا ہو وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

فقر اور علم میں اقبال نے کیسا سبق آموز اور لطیف فرق دکھلایا ہے، میں چند اشعار نقل کرتا ہوں ؎

فقر کے ہاں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم، — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر، علم مقام خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

خودی فلسفہ خودی اور بے خودی اقبال کا خاص مضمون ہے، تاریخ فلسفہ میں اقبال نے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے، اقبال کی بین الاقوامی شہرت کا راز ایک حد تک اس نئے نظام کی بنا ڈالنے میں ہے، اقبال نے اپنی شاعری میں اپنے فلسفے کی مکمل تشریح کی، یہ غزلیں بہت تھوڑی سی ہیں تاہم ان میں خودی پر بعض بہت عمدہ اشعار موجود ہیں، خودی کے صحیح مفہوم کے لئے اس کی نظموں کا مطالعہ ناگزیر ہے، ذیل میں چند منتخب اشعار درج کرتا ہوں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں — جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں،
یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی
بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت — پربت ضعف خودی سے رائی
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر — گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

گراں بہا ہی تو بس اک خودی سی ہے ورنہ　　گھر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

تعلیم عمل | یہ دنیا کا پہلا شاعر ہے جس نے عمل کی اتنے شد و مد سے تلقین کی ہے، اقبال کا نظریہ حیات کوشش پیہم اور عمل مستحکم ہے۔

یہ زمانہ کار و پیکار کا ہے، ایشائی قوموں کو اور خصوصاً ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ عیش و عشرت کا خیال تک چھوڑ دیں، اپنی قومیت کو قایم رکھنے کے لئے، اپنے دین و ایمان کو محفوظ رکھنے کے لئے ضرورت ہے جذبہ عمل اور عمل کی، چنانچہ شاعر کس پُراثر طریقہ سے کہتا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اگر موسیٰ کی طرح پھر کوئی نڈر پیدا ہو تو ضرب کلیم بھی دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے ؎

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی　　اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

جس قوم میں تیمور کی شجاعت اور دلیری نہ ہو زندہ رہنے کی مستحق نہیں ہے ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے　　وہ قوم جس نے گنوایا متاع تیموری

زندگی مستقل حرکت ہے، یہ بذات خود اک محرک شے ہے، یہ سفر میں ہے لیکن اس کی کوئی منزل نہیں ہے ؎

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا یہ تو　　کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر شے مسافر ہر چیز راہی،　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی،

اس زمانے کے سیاسی و معاشی مسئلے اس قدر خوفناک اور لاینحل نظر آتے ہیں، لیکن ہم میں کوئی حیدر کرار بھی ہے جو ان کا بہادرانہ مقابلہ کر سکے ؎

بڑھ کے خیبر سے ہیں یہ معرکہ دین و وطن　　اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

انسان خواہ کسی ہیئت میں ہو اگر وہ جان توڑ کوشش نہ کرے تو اس کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی ؎

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں | کچھ کام نہیں بنتا بے جرأت رندانہ

سوزِ یقین | جس طرح پیغام عمل اقبال کی شاعری کا ایک بڑا جزو ہے، اسی طرح ایک مسلمان میں سوز یقین کا ہونا شرط اولین ہے، ان دونوں چیزوں کا یکجا پایا جانا ضروری ہے، عرصہ ہوا کہ شاعر نے کہا تھا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں | جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اور پھر ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم | جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کی عمر کے ساتھ اس کا آرٹ بھی بڑھتا گیا، وہ خیالات جو پہلے دبی زبان سے نکلتے تھے۔ اب نہایت بیباکی سے نکلتے ہیں، اب اس "محفل" میں "دستور زبان بندی" نہیں رہا۔ اُن کی غزلیں تمام خیالات کا مرقع ہیں جو اس کی مشہور نظموں کی زینت ہیں۔

مسلم میں سوز یقین ہو تو شعلہ کی اس کو آنچ تک نہیں لگ سکتی ؎

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش | میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند،

سوز ایمان تمام دنیا کو جلا کر خاک سیاہ کر سکتا ہے اور وہ خس و خاشاک سے دب کر ٹھنڈا نہیں ہو سکتا ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے | جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اگر مسلمان میں مستی یقین نہیں تو وہ کافر ہے اور اگر کافر میں یہ چیز ہے تو وہ مومن ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی، | نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

اس سلسلے میں چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:۔

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے | وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا | لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

متفرق | شاید ہی کوئی شعبہ زندگی ہو جس پر اقبال کی شاعرانہ نظر نہ پڑتی ہو، وہ مسلمانوں کی پژمردگی ان کا زوال، ان کے تمدن کا مٹنا، ان کا غلام رہنا، ان کا ذلیل وخوار ہونا، دیکھ کر کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں اس قوم کو زندہ کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے، لیکن افسوس کہ ہم اس کے کلام کی داد دیتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے، بہر حال اس مقام پر میں ناصحانہ انداز نہیں اختیار کر سکتا، یہ محض جملہ معترضہ تھا۔

اقبال کو حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں کوئی آدمی کیوں نہیں پیدا ہوتا حالانکہ، ایران و تبریز، وہاں کی آب وہوا اور وہاں کی سرزمین بجنسہٖ ویسی ہی ہے جیسی اس وقت تھی، جس انداز میں شاعر اس افسوس کا اظہار کرتا ہے نہایت پُر اثر اور دلکش ہے ؎

وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی — نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

پہلے مصرعے سے کس قدر حسرت ٹپکتی ہے!

ہندوستان میں اورنگ زیب کے عہد میں اسلامی حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ شاعر ذات باری سے التجا کرتا ہے کہ مسلمان کافی ذلیل وخوار ہو چکے اب وقت آ پہنچا ہے کہ ہم پر دوبارہ نظر کرم کرے ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اقبال نے ایک سچے مسلمان کو ہمیشہ شاہیں سے تشبیہ دی ہے اور یہی تشبیہ اس کے لئے موزوں ہے، محلوں اور عالی شان عمارتوں میں رہ کر عیش وعشرت کرنا اس کی تحقیر ہے ؎

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں — کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد میں — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

آجکل ہمارے سیاسی اور دینی رہنماؤں کا جیسا حال ہے معلوم ہے، کوئی کسی پر یقین نہیں کرتا ہر شخص بدگمان ہے، اس کی ایک بڑی وجہ ہمارا شاعر یوں بتاتا ہے ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے — کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

پیشوائے قوم میں چند صفات کا پایا جانا ضروری ہے، ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

نگاہ مومن کی اقبال نے بڑی تعریف کی ہے، ان غزلوں میں بھی اس کا ذکر بہت آیا ہے مومن کی نظر کی تاب کوئی نہیں لاسکتا، اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں ؏

تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے ترا جذبِ قلندرانہ

اسی طرح مومن کی آواز بھی اتنی بارعب ہوتی ہے کہ اس سے پہاڑوں کے دلوں میں بھی خوف طاری ہوجاتا ہے ؎

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ مومن کی نگاہ سے اتنا رعب طاری ہو کہ شیروں کے بھی حواس جاتے رہیں، مومن بھیڑ بکری کی طرح ڈرا نہیں کرتا، اگر خوف سے اس نے آہ سرد نکالی تو وہ مومن نہیں ؎

نگاہ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اُڑ جائیں
نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی

اقبال پان اسلامزم کا بہت بڑا حامی ہے، اس نے زندگی بھر اسلامی اخوت کی تعلیم دی ہے مسلمان کسی خاص ملک کا باشندہ نہیں ہے، اس کی کوئی مخصوص ملکی قومیت نہیں ؎

مومن کا مقام ہر کہیں ہے — مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے

ترانۂ ملی میں اسی خیال کو اقبال نے کتنے پُرجوش طریقے سے پیش کیا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بال جبریل میں یہ جوش اور امنگ نہیں ہے، یہاں سنجیدگی ہے، یہاں شاعر شاعر ہی نہیں رہا بلکہ صاحب الہام ہوگیا ہے، آج کل اکثر اسلامی ممالک میں قومی تحریک جاری ہے اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ لگاؤ نہ رہے، شاعر اس کے سخت خلاف ہے، لیکن ذرا ملاحظہ کیجئے کہ بجائے رونے دھونے یا غصّہ ہونے کے وہ کتنے حسرتناک لہجے میں کہتا ہے ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

پھر کہتا ہے ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

ان مضامین سے سیکڑوں ورق بھرے جا سکتے ہیں۔

مغربی تمدن کی ہجو: اس مضمون پر اقبال نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے، یوں تو اکبر الہ آبادی کی کل شاعری کا یہی موضوع رہا مگر اقبال اور اکبر میں بڑا فرق ہے، اکبر نے یورپی تہذیب کا ہنس ہنس کر مذاق اُڑایا ہے اکبر کے کلام میں تمسخر زیادہ اور ادبی طنز کم ہے، شاعر کا مقصد محض لوگوں کو خوش کرنا تھا، اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو مغربی کلچر سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ اس کے سخت خلاف تھا بایں ہمہ وہ اس نئی تہذیب کے مخصوص معائب کو ان کے اصلی رنگ میں ہمارے سامنے نہ پیش کر سکا۔ اس کے برخلاف اقبال نے بڑی متانت اور دوراندیشی

ے اس چیز کو ہاتھ لگایا۔ اقبال کی شاعری مبہم نہیں اس کے خیالات نہایت سلجھے ہوئے اور مترتب ہوتے ہیں، وہ زبان کے ساتھ اس طرح نہیں کھیلتا کہ اس کی الجھنوں میں پھنس کر اپنا مطلوب و مقصود کھو بیٹھے۔ اکبر اور اقبال میں دوسرا بہت بڑا فرق یہ ہے کہ بسا اوقات اکبر کا منشاء صرف ہجوگوئی ہوتا ہے، فن بجائے خود کوئی چیز نہیں، اقبال کو اس نظریہ شاعری سے سخت نفرت ہے۔ اقبال مغربی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لیتا ہے لیکن اس کی نظر بہت گہری ہوتی ہے، وہ غوطہ لگاتا ہے تو اس کے ہاتھ موتی لگتے ہیں گھونگھے نہیں، وہ اپنے محاکمات میں محض شاعرانہ حیثیت سے نظر نہیں آتا، وہ فلسفی اور صاحب الہام بھی ہے، وہ کوئی نکتہ مذاق کے لئے نہیں پیش کرتا۔ اکثر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزاروں سال کا انسان ہے جس نے اقوام عالم کی تاریخ خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اس طویل عمر کے بے شمار تجربات نے اس کا ایک مخصوص نظریہ حیات پیدا کیا ہے اور اس نظرئے کا وہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑا ہو کر بڑے زور شور سے اعلان کر رہا ہے، ہم پست نشینوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے وہ ہمارا ہمدرد اور ہم پر مہربان ہے۔

ہماری قدیم شاعری میں ہجوگوئی ایک مستقل صنف کلام تھی، لیکن موجودہ دور میں یہ چیز بالکل مفقود سی ہوگئی ہے، اس صنف کو غزل سے کوئی رشتہ نہ تھا، یہ اقبال کا زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے غزل کی محدود دنیا میں ایک ایسی وسعت کا اضافہ کیا ہے، ذیل میں میں اقبال کی اس مخصوص جدت پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالوں گا۔

مغرب و مشرق کی زندگی میں ایک اصولی فرق ہے، مغرب مادیت پرست ہے اور مشرق روحانیت پرست، اس فرق کو اقبال فکر و ذکر کے نام سے یاد کرتا ہے یعنی مغرب فکر کا قایل اور مشرق ذکر کا شیدا۔ کہتا ہے ؎

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ — وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

نطشہ جرمنی کا مشہور "مجذوب فلسفی" تھا جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے اسکے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا "نطشہ گویا مغرب کی روحانی و مادی کشمکش کا ایک نمونہ ہے" ایک شعر میں اقبال اُس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

آج یورپ کی چمک دمک دیکھکر ہماری نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، ہم مغرب کی ترقی کو انسان تہذیب کا کمال سمجھتے ہیں لیکن شاعر کہتا ہے۔

نہ کر فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

اس دور میں فکر مغرب نے زمانہ قدیم کی جادوگیری کو پھر زندہ کر دیا ہے اسلئے جس قوم کے پاس عصائے موسیٰ نہ ہو اس عہد میں اس کا گذر مشکل ہے ؎

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم — گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

اہل فرنگ کو باوجود ان کی انتہائی کوشش کے روحانی و قلبی مسرت نہ حاصل ہو سکی۔ وہ بیچارے بڑی بے بسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اقبال ان کے زخموں پر اس طرح نمک چھڑکتا رہتا ہے ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام — وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

ایک دوسرے مقام پر شاعر یورپ کی کھوکھلی تہذیب کا اس طرح خاکہ اُڑاتا ہے ؎

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

نئی تہذیب سے مشرقی تمدن کو جو نقصان پہنچا ہے اظہر من الشمس ہے اس کی مختصر حقیقت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا — دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

اس موضوع پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

یا عقل کی روباہی، یا عشق ید اللّٰہی، | یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ،
یہ مدرسہ یہ جواں یہ سرور و رعنائی | انھیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد
مجھکو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندیقی | اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ | دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا | افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند
دیار کہاہے اسکو زخم در کی تیزدستی نے | بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
سوال مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں | کہ یہ طریقۂ رندانِ پاکباز نہیں
خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ | سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

فضیلت انسانی | اقبال کی بہت سی شاعرانہ خوبیاں دیگر شعراء کے یہاں بھی ہیں فرق اتنا ہے کہ دوسرے شعراء میں سے اکثر رہروانِ منزل ہیں مگر اقبال عینِ منزل میں ہے۔ لیکن ان سب کے قطع نظر اقبال کی شاعری میں ایک ایسا نکتہ ہے جو میرے خیال میں آج تک شعر و ادب میں نظر نہ آیا تھا۔ عموماً شعراء کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ مخلوقات عالم اور عالم کو فانی کہتے رہے ہیں۔ انھوں نے حیات انسانی کی بے ثباتی اور کم بضاعتی پر اکثر آنسو بہائے ہیں، نہ محض ہمارے شاعروں نے بلکہ ہر ادب اور ہر ملک میں شعراء نے انسان کو نہایت حقیر، بے بس اور کم مایہ سمجھا ہے، اقبال پہلا شاعر ہے جس نے آدمی کو یاد دلایا کہ تم اشرف المخلوقات ہو، یہ کل کائنات تمہاری ہے، اس کا وجود تمہارے وجود سے وابستہ ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

پھر کہتا ہے کہ تو اتنا پست و حقیر نہیں تیرا درجہ بہت بلند ہے، یہ چیزیں جو تو دیکھتا ہے یہ سب تیرے تابع ہیں، یہ چاند و تارے اور یہ آسمان سب تیرے نیچے ہیں۔

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اُٹھا یہ مقام آسمان سے دور نہیں

یہی نہیں، اقبال دنیا کی ہر شئے کو بہت کمزور اور لاچار سمجھتا ہے، اگر کسی چیز کو اللہ نے قوت بخشی ہے تو وہ انسان ہے۔ تمام اعلیٰ مناصب آدمی اور صرف آدمی کے لئے ہیں ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شاعر کہتا ہے کہ انسان خواہ مخواہ اپنے کو چھوٹا اور بے مایہ سمجھتا ہے، وہ چاند سورج کی بلندی سے سہم جاتا ہے یہ محض اس کی تنگ نظری ہے کیونکہ انسان تو عرشِ معلیٰ تک پہنچ چکا ہے پھر اس پر اور کس شے کو فضیلت مل سکتی ہے۔

ایک مقام پر اقبال فرشتوں کے سردار کو یوں مخاطب کرتا ہے کہ اے جبرئیل تو انسانوں کی نقل کیا کرتا ہے، اُس کی جذب و مستی تجھ میں کہاں سما سکتی ہے۔ فرشتوں میں یہ تاب کہاں وہ تو اپنی خاموشی میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کئے جائیں ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

ایک دوسری جگہ وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی شوخی سے کہتا ہے کہ تو فرشتوں پر کیوں اس قدر نازاں ہے، ذوق و شوق یہ کیا جانیں، ناز و نیاز یہ کیا سمجھیں ؎

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال کی بڑی خوبی یہ کہ وہ ایک ہی معنی کو ہزار طرح سے پیش کرتا ہے اور ہر مرتبہ نئے انداز سے اور اس کی ہر ادا دلفریب و دلکش ہوتی ہے، دیکھئے اسی تخیل یعنی ہستی انسانی کا اعلیٰ مرتبت

کو وہ کیسے اچھوتے رنگ میں پیش کرتا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

یہ اجرام فلکی انسان کے حاسد معلوم ہوتے ہیں، اس شعر میں علم نجوم کی طرف شاید کچھ اشارہ کیا جاتا ہے کہ ستاروں کی حرکت تاریخ عالم سے وابستہ ہے، مگر شاعر کے نزدیک یہ اور ہی چیز ہے۔ ستارے صرف بغض وعناد کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ تمدن انسانی کا تمام دار ومدار ان کی حرکت پر منحصر ہے، مگر ان کو معلوم ہے کہ انسان کی منزل سب منزلوں سے بالا تر ہے اس لئے وہ بہت خوف کھائے ہوئے ہیں، ستاروں کے خوف کا اظہار ان کے ٹوٹنے سے ہو سکتا ہے۔

آدمی کی فضیلت کا کمال یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پھر اپنی کھوئی ہوئی منزل پر پہنچے تاکہ اس کے صدقے میں ان چیزوں کی بھی کچھ قدر ہو ؎

عروجِ آدمیِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

اقبال کو اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ انسان خدا کا حقیقی نائب ہے، وہ اس کا عزیز ہے، اس کا راز داں ہے، اس کا محبوب ہے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے شکایتہً عرض کرتا ہے ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

آپٹیمزم یا رجائیت اُمید اور اولوالعزمی کی تعلیم اقبال کے خاص موضوع شاعری ہیں، تاریخ ادب عالم میں بیشک ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شعرا نے ملک کی سیاسیات کو بدل دیا ہے یا قوموں اور شخصوں کی ذہنیتیں تبدیل کر دی ہیں، مگر ایسی شاعری ہمیشہ وقتی رہی ہے بائرن کی چائلڈ ہیرولڈ (Child Harold) کو پڑھ کر اس وقت کوئی یورپین جہاد پر نہیں آمادہ

ہوسکتا رودکی کے قصیدے کی آج کل صرف ادبی اہمیت رہ گئی ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ اس کی برخلاف اقبال قدم قدم پر ہم سے کہتا ہے کہ بڑھے چلو تمہاری راہ میں کوئی روڑا نہیں، یہ زمین و آسمان کیا چیز ہیں تم تو لامکاں تک پہونچ سکتے ہو۔

نوا ہے سپرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

ہماری دنیا پرانی ہو چکی ہے، اس کی چیزوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئی ہیں، شاعر التجا کرتا ہے کہ اے خدا اب تو مجھ کو ایک نئی دنیا دے جس کو تونے ابھی ابھی خلق کیا ہو۔

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

شاعر ایک جگہ پہلے بھی کہہ چکا ہے کہ کل موجودات عالم انسان ہی کے لئے ہے، اس لئے اس کو چاہیئے کہ فطرت کی رموز کو سمجھے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر، تسخیر مقام رنگ و بو کر

بزم قدرت میں انسان نے بڑی عجیب و غریب چیزیں دیکھی ہیں جن پر وہ اکثر بے خبر ہو جاتا ہے، پھر بھی فطرت میں بہت سی باتوں کی کمی رہ گئی ہے، شاعر کہتا ہے اے انسان تو خدا کی قدرت کا شاہکار ہے اس لئے تو ان کمیوں کو پورا کر۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

انسان کو اولو العزمی اور بلند پروازی کی تعلیم یوں دیتا ہے۔

تاروں کی فضا ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقام آرزو کر

انسان اپنی تقدیر کا تابع نہیں، وہ بے وقوف ہیں جو اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

ہر شخص اپنی تقدیر خود تعمیر کر سکتا ہے، شرط محض یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو بلند کرے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں آجتک کسی شاعر کو ایسے کلمے کہنے کی جرأت نہ ہوئی ہوگی
اقبال اقوام ایشیا کو اکثر مخاطب کرتا ہے، ان کی پژمردگی پر وہ اس طرح آنسو بہاتا ہے ؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

لیکن پھر وہ ہم کو اس طرح اُمید دلا کر خوش کرتا ہے ؎

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں،
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں،

کیوں؟ اس لئے کہ ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں،
اسی روز و شب ہی اُلجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں،

<u>متفرق</u> اس مقالے کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ اقبال کی غزلوں میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کی داستانیں کم ہیں اور ہیں بھی تو وہ عشقیہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں جس کی ہمارے ادب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اقبال حقائق زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ لیکن یہ نظر صرف فلسفیانہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ شعر کے دلکش لوازمات میں پنہاں ہوتی ہے، اقبال کی غزل کے بہت سے مضامین تو میں گنا چکا ہوں، چند متفرق خیالات اور دیکھ لیجئے۔

اشتراکیت کے علمبردار اخوت اور مساوات کی تعلیم کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حکومت مزدوروں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے کیونکہ ملک کے تمام لوگ انھیں کی مشقت و محنت پر جیتے ہیں، لیکن ہمارا شاعر کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط نظریہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مزدوروں

کے ہاتھ اگر حکومت آجائے تو وہ سرمایہ داروں کی ظالمانہ حرکتوں کو اپنا لائحہ عمل بنالیں، خود ان کو وہی طریقہ کار اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہو جس کو مذموم کہتے ہیں ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

دین و سیاست دو جدا چیزیں نہیں بلکہ حیات انسانی کے دو مختلف نظام ہیں انکا آپسمیں جدا رہنا دونوں کے لئے مہلک ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر حکومت مذہب کی بندشوں سے آزاد ہوجائے تو وہ خونخواری اور چنگیزی ہو کر رہ جاتی ہے، موجودہ یورپ اس کی بہترین مثال ہے چنانچہ اقبال کہتا ہے ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہجاتی ہے چنگیزی

اپنی نظموں میں ایک مقام پر اس مسئلہ کو اس طرح پیش کرتا ہے ؎

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

اقبال طنزیات کا بہت بڑا ماہر ہے اس صنف کلام کی اسکے یہاں فراوانی ہے، اس مقام پر ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لیجیے۔ اقبال کہتا ہے کہ ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ ترک بڑے ہوشمند اور سمجھدار ہیں مغرب کی تقلید کو انھوں نے اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ لیکن آہ میں ان نادان ترکوں کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ سراسر دھوکے میں ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ اقبال اس چیز کو کتنے شرح وبسط کے ساتھ کتنے لطف انگیز پیرائے میں کہتا ہے ؎

سُنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی — سُنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا — ستارے جن کی نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

اقبال کا مستقبل بہت اُمید افزا ہے رہ رہ کر اس کے دل میں ولولے اُٹھتے ہیں کہ مسلمان پھر

کیوں نہیں جہاں بانی کرتا، وہ پھر کیوں نہیں "خسرو اقلیم دل" ہوتا، اس میں وہ جذب و مستی پھر کیوں نہیں پیدا ہوتی جس کی وجہ سے اس کے اسلاف نے زمین و آسمان پر حکومت کی تھی۔ اس کیف کے عالم کا وہ اس طرح ترجمہ کرتا ہے ؎

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہ سنجر و فقر جنید و بسطامی

اقبال کا غلامی کا تخیل دیکھئے کس قدر انوکھا اور صحیح ہے ؎

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی ۔۔۔ جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہیں وہی زیبا

اور پھر سنئے کہ غلاموں کی ذہنیت کو کس قدر ذلیل سمجھتا ہے ؎

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر ۔۔۔ کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

ملوکیت اور شہنشاہیت تہذیب انسانی کے لئے سخت مضر ہے، جب اس طرز حکومت کا دور دورہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی مخلوق پر ناراض ہو کر انھیں میں سے دو چار کو منتخب کر کے اس کام پر مامور کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی بھائی بندوں کو ایسی سزا دیں کہ وہ بھی یاد رکھیں، اس نکتے میں اقبال کی سیاسی باریک بینی ملاحظہ کیجئے ؎

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

گاندھی جی نے چاہا تھا کہ وہ فاقہ کر کے ہندو مذہب سے ذات پات اور چھوت چھات کو نکال دیں، لیکن افسوس کہ ان کی چال کارگر نہیں ہوئی، برہمن ان کے ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا کیونکہ طلسم سامری کو عصائے موسیٰ ہی توڑ سکتا ہے۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ایک جگہ مسئلہ آواگون پر اقبال اس طرح روشنی ڈالتا ہے — اے خدا اگر انسانوں کو تو اسی واسطے پیدا کرتا ہے کہ وہ بار بار جیتے مرتے رہیں تو مجھ کو بتا کہ اس میں فائدہ کیا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ کارزانی

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دوبارہ نہیں پیدا ہوتا، مرنے کے بعد انسان کو زندگی دوام ملتی ہے اور اس کی روح حالت سفر میں ہوتی ہے، یہ دنیا اس سفر کی منزل اولیں ہے ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولیں　　مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں!

امام رازی بہت مشہور مفسر قرآن گذرے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے قرآن پاک کے باریک نکتوں کو اس خوبی سے سمجھا، اور سمجھایا لیکن اُن کے دلائل عقلی سے ضعف یقین کا مداوا ممکن نہیں چنانچہ شاعر کا تجربہ ہے کہ ؎

علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا　　غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

۱۹۳۱ء میں اقبال نے اسلامی ممالک کی سیاحت کی تھی، دوران سفر میں اس نے بعض بے بہا نظمیں لکھی ہیں، اقبال خود پوچھتا ہے کہ آخر مجھ میں جوانی کی اُمنگیں اور جوش و خروش پھر کیسے عود کر آئے، پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ شاید قرطبہ کی آب و ہوا کا اثر ہے (شاعر نے سیاحت کا کافی حصہ ہسپانیہ میں گذارا تھا جہاں اس نے آثار اسلامیہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔)

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شبابی

نمونے کے لئے یہ چند اشعار جو اوپر آچکے ہیں کافی ہیں، اصحاب ذوق و سخن شناس بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اقبال کا اصل موضوع شاعری کیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے ایک چیز اور پیش کرونگا اور پھر مضمون ختم ہے۔

اقبال کا تغزل تغزل کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ شعر میں سوز و گداز ہو، حلاوت ہو، چاشنی ہو۔ بجائے دماغ کے دل کو اپیل کرے پڑھنے والے کو ایک انبساط حاصل ہو، اس کے قلب کو حرکت ہو، دیگر الفاظ میں وہ تمام خوبیاں جو ایک غزل میں ہونی چاہییں، تغزل غزل میں بھی ہو سکتا ہے اور نظم میں بھی اقبال کی شاعری میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔ فصاحت و بلاغت، معنی آفرینی ندرت خیال و ندرت ادا اور موسیقی تو تقریباً ہر صنف شاعری کی جان ہیں۔

سوز و گداز

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

پہلے تو آپ اس عشق حقیقی کی داد دیجئے۔ عاشق کے نالوں سے کون و مکان گونج اٹھتے ہیں، یہاں تک کہ عرش بھی ہل گیا ہے، شعر میں ایک طرف تو آرزو کی ولولہ انگیزی اور دوسری جانب اس آرزو کے اظہار کا اثر، میرے خیال میں شاید ہی کوئی صاحب ذوق ہو گا جس پر اس شعر کو سن کر والہانہ کیفیت نہ طاری ہو جائے۔ زبان کی پاکیزگی بھی تخّیل کی بلندی سے مطابقت کرتی ہے شاعر کہتا ہے کہ اے خدا اگر دنیا کی چالیں ٹیڑھی ہیں اور آسمان گردش میں ہے تو مجھ کو اس کی کیا فکر ہے۔ ہے تو سب تیرا ہی کیا دھرا ؎

اگر کجرو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو؟ جہاں تیرا ہے یا میرا

طرز ادا ملاحظہ کیجئے، کس قدر شیریں اور دلچسپ ہے پھول کی تھوڑی سی زندگی کا دردناک نوحہ صرف ایک شعر میں سنئے ؎

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟

شاعر کی التجا میں اس کی انتہائے شوق اور اس کی بیقراری ملاحظہ ہو ؎

کر مجھکو پہلے زندگی جاوداں عطا | پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا
کانٹا وہ دے کہ جسکی کھٹک لازوال ہو | یارب وہ درد جسکی کسک لازوال ہو

ایک جگہ سوز وساز کے ساتھ شوخی اور پرواز خیال دیکھئے سہ

نہ کردیں مجھکو مجبور نوا فردوس میں حوریں | مرا سوز دروں پھر گرمی محفل نہ بن جائے

دوسرے عاشق اپنے مرض کے بڑھنے کی دعا کرتے ہیں، یا دیوانے اور مجنون ہو کر صحرا د بیابان میں نکل جاتے ہیں، اقبال کے یہاں یہ رنگ نہیں۔ عاشق اپنا علاج خود تجویز کرتا ہے سہ

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی | علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

لیکن ذیل کے شعر میں دیکھئے کہ شاعر کس طرح رو رو کر کہتا ہے سہ

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے | وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

انسان کسقدر لاچار ہوجاتا ہے جب قدرت اسے مجبور کردیتی ہے شاعر اللہ تعالیٰ سے نہایت پر درد لہجے میں شکوہ کرتا ہے سہ

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا | یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

شاعر کی دلیل کس قدر انوکھی ہے!

شاعر ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی ہے، اس کو زمانے سے شکایت نہیں سہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں | نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ!

اقبالؔ کی شاعری میں ایک معرکتہ الآرا نکتہ ہے کہ ذاتی اغراض کی بنا پر اس نے کبھی زمانے کا رونا نہیں رویا۔

مضمون طویل ہوا جاتا ہے، اس لئے اس ذیل میں چند منتخب شعر پیش کر کے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں سہ

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ | ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی، | اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے | دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں | کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنّت ہے جس میں حور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا
تو ہی آمادہ ظہور نہیں،

ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیث کلیم و طور نہیں

فلک نے انکو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کیلئے

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا دا بھی کر یا پادشاہی،

یہ پچھلے پہر کا زردرو چاند
بے راز و نیاز آشنائی،

تیری قندیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی،

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

یہ تھوڑے سے اشعار نمونے کے لئے کافی ہیں، اقبال کا رنگ تغزل بذات خود ایک اتنا زبردست مضمون ہے کہ دو چار الفاظ میں اسکی تشریح نہیں ہو سکتی، انشاء اللہ کبھی موقعہ ملا تو موضوع پر مفصل بحث ہوگی۔

اس سلسلے میں اقبال کے اسلوب (اسٹائل) پر چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اقبال کا طرز بہت زیادہ شگفتہ اور دلکش ہوتا ہے، جس طرح وہ اپنی نظموں میں ایک ہی خیال کا بار بار اعادہ کرتا ہے غزلوں میں بھی اس کا یہی حال ہے، لیکن ہر مرتبہ نئی شان سے نئے آن بان سے، بعض مرتبہ اس کے شعر ایسے پھڑکتے ہوئے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کے کیف میں بالکل گم ہو جاتا ہے، اور کبھی تو صرف ایک مصرع ہی ایسا سانچے سے ڈھلا نکلتا ہے کہ اسے ہزار بار دہرائیے اور ہر بار آپ کو ایک نیا لطف حاصل ہوگا، ایک نیا تجربہ ہوگا، مثلاً۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑی ہوکر کوئی بلند ہستی ہم کو یہ حقیقت بتلا رہی ہے پہلے مصرع پر غور کیجئے، تعجب ہوتا ہے کہ شاعر کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے ہوں گے۔ دوسری مثال:-

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اس شعر میں بھی پہلا مصرع لاجواب ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود شاعر کی زبان سے سن رہے ہیں تبریز اور رومی کی تصویریں فوراً ہمارے سامنے آجاتی ہیں تیسری مثال:-

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

جس بے لوث محبت سے شاعر یہ خیال ظاہر کرتا ہے اس کا اصلی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ چوتھی مثال سے

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گذر

اس شعر کو ایک بار پڑھکر آپ ہرگز لطف اندوز نہیں ہو سکتے، شعر خود مجبور کرتا ہے کہ آپ اسے بار بار پڑھئے اور محظوظ ہوجئے۔ یہ شاعر کا کمال ہے۔

رنگ تغزل کے سلسلے میں آخری چیز موسیقی ہے۔ خواہ غزل ہو خواہ نظم ہو اقبال کے ہر شعر میں موسیقیت کی روح موجود ہے، یہ سب کو معلوم ہے اب تک اقبال اپنے اشعار ادبی مجلسوں میں نہایت ترنم اور خوش الحانی سے پڑھا کرتا تھا، لیکن ہر شاعر اپنا کلام ترنم سے

پڑھ سکتا ہے اس میں ترنم ہو یا نہ ہو، بہر حال اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اقبال کی شاعری سراسر موسیقی ہے، اگر اُردو اور فارسی میں اتنی موسیقی کسی کے کلام میں ملتی ہے تو وہ صرف حافظ کا کلام ہے اقبال کو اپنے اس کمال کا خود احساس ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی!

ایک دوسرے مقام پر وہ اپنی قدردانی یوں کرتا ہے ؎

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

میں اور مثالیں نہیں پیش کرتا صرف دو غزلوں سے چند اشعار درج کرتا ہوں جن کے ہر ہر لفظ میں نغمہ ہے سرود ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگے مرغِ چمن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن!

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیل گوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

عرصہ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی ‏ ‏ داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک ‏ ‏ جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

حضرات اقبال کی غزل کے متعلق اور بہت کچھ کہنا تھا مگر وقت کی تنگی اور مضمون کی طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں جو کچھ میں نے آپ کے سامنے ابھی پیش کیا ہے۔ یہ مضمون بالکل نامکمل ہے تاہم اخیر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اقبال کی غزلوں سے اُردو ادب میں ایک نئے اور بہت شاندار دور کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت اگر ہم یورپ کی ر (Lyrical Poetry) یعنی عشقیہ شاعری کے مقابلے میں اُردو سے کوئی چیز پیش کر سکتے ہیں تو وہ یہی اقبال کی غزلیں ہیں! یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں لوگ اقبال کی اس کوشش کی داد نہ دے سکیں شاعر بہر حال اس کا محتاج نہیں، وہ خود کہتا ہے ؎

میری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

اس لئے ؎

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

اقبال کے کلام میں عشق کا تخیّل

(جناب ضیاء احمد صاحب ایم، اے بدایونی لکچرار شعبہ فارسیہ نگران علی گڑھ میگزین)

عشق کے بارے میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اب اُس پر کسی معتدبہ اضافے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی اہل لغت کہتے ہیں عشق دوستی میں حد سے گذر جانے یا محبوب کے عیوب کا احساس جاتے رہنے کا نام ہے اُن میں سے بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ عشقہ (عشق پیچاں) سے ماخوذ ہے جو ایک بیل ہے کہ شروع میں سبز ہوتی ہے اور آخر میں پتلی اور زرد پڑ جاتی ہے۔ چونکہ عشق کا آغاز و انجام بھی اسی قبیل سے ہے اسلئے اُس کو اس نام سے موسوم کیا گیا۔ ماہرین لسانیات نے دلی لگاؤ کے مختلف مدارج بتائے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ محبت کا ابتدائی درجہ ہویٰ ہے، پھر علاقہ پھر کلف۔ پھر عشق اس کے بعد شعف۔ پھر شغف۔ پھر جویٰ۔ پھر تیم۔ پھر تدلیہ اور سب سے آخر ہتیم اطبا کا قول ہے کہ عشق ایک وسوسہ یا جنون کی قسم کا مرض ہے جو حسین صورت کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ حضرات صوفیہ کی تحقیق ہے کہ العشقُ نارٌ تحرقُ ما سوا المحبوب یعنی عشق ایک آگ ہے جو ماسوا کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ بجز معشوق کوئی باقی نہیں رہتا۔ شعرا کا فیصلہ ہے کہ

بہ عالم ہر کجا درد و دلے بود ۔۔۔ بہم کردند و عشقش نام کردند

غرض جتنے منہ اُتنی ہی باتیں۔ ہمارے شعرا خصوصاً اساتذہ فارسی نے جذبہ عشق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور عشق کی لطیف اور نازک واردات کو جن نادر پیرایوں میں ادا کیا ہے اُن کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے اور اگرچہ عموماً اُن کے کلام میں عشق کے متعلق کوئی واضح مفصل اور مربوط بیان تلاش کرنا بے سود ہوگا تاہم جس قدر وہ لکھ گئے ہیں وہ اُن کی قادر الکلامی کی برہا

کمال جوهر نوریان مشت خاک است
گریزان آدم خاکی جبریل بیباک است

کن [illegible] ذره [illegible] ازان گوهر
[illegible] جلوهٔ کف خاک است

نوا [illegible] ستاره و مردم را
خرد [illegible] شده چالاک است

جمال [illegible] عشق می بازند
تنها بدوش گل و لاله به خونین چاک است

تو از دیده گل و لاله نادیده مشو
که شاخ زندگی ما ز نم نمناک است

چه خوش تر [illegible] ام بخلوت دوست
نماز [illegible] نفس پاک است

درین چمن [illegible] سرود [illegible] این نوا ز کجاست
[illegible] سر [illegible] تاک است

اقبال

محکم ہے۔ اِس جگہ اُس کا استقصاء نہ مطلوب ہے نہ مناسب۔ ہمارا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام اور پیام میں عشق کا جو تخیّل پیش کیا ہے اُس کی وضاحت کی جائے۔ اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر حتی الوسع روشنی ڈالی جائے۔

حضرت اقبال بین الاقوامی حیثیت کے مفکّر اور شاعر ہیں۔ اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ اُن کے بارے میں کچھ لکھنا اُن کا نہیں۔ بلکہ اپنا عیارِ سخن ظاہر کرنا ہے۔

مادحِ خورشید مدّاحِ خود است　　　　که دو چشمم روشن و نامر مد است

لیکن دراصل اِس بحث پر اظہار خیالات کا مدّعا صرف حضرت موصوف کی بارگاہ کمال میں اپنا خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم۔

اقبال کی شاعری نے جو پیغام زندگی امتّ مسلمہ کو دیا ہے اُس کے نسبت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ رفعت افکار۔ یہ متانت خیالات اور یہ صدق جذبات آج عرب وعجم دونوں کے کلام میں مفقود ہے۔ جیسا کہ ہر بڑے مصلح اور ہر بڑے شاعر کا خاصہ ہے کہ اُس کے یہاں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد تمام افکار گردش کرتے ہیں اسی طرح اقبال کی تعلیمات کا محور خودی ہے خودی کا مسئلہ بذات خود تفصیل طلب ہے۔ مگر یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اقبال کے نزدیک اظہار خودی کا مفہوم یہ ہے کہ نفس انسانی کی مرکزی قوتوں کو معطّل نہ چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ کسی بلند مقصد کے ماتحت بہ احسن طریق بر روئے کار لایا جائے۔ خودی کے بعد اُنھوں نے جس چیز پر شاید سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ عشق ہے۔ عشق کیا ہے؟ آؤ دیکھیں وہ خود اُس کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔

عشق وہ جذبہ کامل ہے جو خودی کی صلاحیتوں کو آشکار کرتا۔ اُن کو صحیح راہ پر لگاتا اور استواری بخشتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است　　　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پاینده تر　　　　زنده تر سوزنده تر تابنده تر

از محبت اشتعالِ جوہرش ارتقائے ممکناتِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوز دز عشق عالم افروزی بیاموز دز عشق
عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز روم را در آتشِ تبریز سوز ،

انسان کو چاہئے کہ کسی کا ہوکر رہے ۔ اگر دل میں تڑپ اور طبیعت میں گداز نہیں تو انسانیت کاملہ کے مقام تک رسائی معلوم ۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلامِ شمسِ تبریزی نہ شد

ظاہر ہے کہ خودی کے بیدار ہونے کے اعتبار سے سکندر اور چنگیز ۔ تیمور اور نپولین بھی بلند درجہ رکھتے تھے ۔ مگر عشق کی دولت سے محروم تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی خودی راہ راست سے ہٹ کر غلط رستے پر پڑ گئی تھی ۔ اِن لوگوں نے کل دنیا میں اپنے عظمت کا تہلکہ ڈالدیا تھا اور اپنے کارناموں سے عالم کو متزلزل کر دیا تھا ۔ مگر آج کتنے ہیں جو ان کا نام احترام سے لیتے ہیں ۔ ان کے برخلاف عاشق (کہ مومن کامل کا دوسرا نام ہے) اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ قلوب پر حکمرانی کرے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل بھی کئے خدائے رحمٰن عنقریب اُن کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے گا) یہ کیوں ؟ اسلئے کہ وہ کسی سے صلح کرے یا لڑائی ۔ دوستی رکھے یا دشمنی ۔ ہر صورت میں اُسے رضائے محبوب مدنظر ہوتی ہے ۔ وہ اگر "زجاج دوست" کو توڑتا بھی ہے تو "سنگ دوست" سے

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری است جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

دراصل یہی "ہجرت سوئے دوست" کا راز ہے جو آیۂ قرانی اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ میں مضمر ہے ۔ (حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا اِنَّنِیْ الخ

..... یعنی جن بتوں کی تم پرستش کرتے ہو مجکو اُن سے کچھ سروکار نہیں مجھے تو اُس خدا ہی سے سروکار ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے)۔

جس طرح عشق کے بغیر خودی، خود بینی اور خود سری کی مترادف ہو جاتی ہے اسی طرح اُس کے بغیر علم، جہالت اور ضلالت کا ہمسر ٹھہرتا ہے۔ یہی نکتہ ہے جس کو عارف روم نے اپنے انداز میں نہایت دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

علم ہائے اہلِ دل حمّالِ شان — علم ہائے اہلِ تن احمالِ شاں
علم چوں بر دل زنی یارے شود — علم چوں بر تن زنی بارے شود

اقبال کا طریقِ ادا بھی کچھ کم دلکش نہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں
علم را بے سوزِ دل خوانی شر است — نورِ او تاریکیٔ بحر و بر است
علم ترساں از جلالِ کائنات — عشق غرق اندر جمالِ کائنات
بے محبت علم و حکمت مردہٗ — عقل تیرے بر ہدف ناخوردہٗ

دوسری جگہ ارشاد کرتے ہیں۔

علم در اندیشہ می گیرد مقام — عشق را کاشانہ قلبِ لاینام
علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانۂ افکار نیست،
ایں تماشا خانہ سحرِ سامری است — علم بے روح القدس افسونگری است

موجودہ علوم کے متعلق حضرت اقبال کا فتویٰ سنئے اور داد دیجئے، حقیقت یہ ہے کہ بلندیٔ جذبات اور زورِ بیان کے لحاظ سے اُن کے کلام کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کے لٹریچر میں بھی اُس کی مثالیں کم یاب ہیں۔

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے — کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام | راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است | بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندانِ مظاہر بستۂ | از حدودِ حس بروں ناجستۂ

دانش حاضر کی اس سے جامع تعریف خیال میں نہیں آتی۔ بت پرست و بت فروش و بتگر است۔ اقبال نے اکثر "عقل" کو "عشق" کے ناکام حریف کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور دونوں کا موازنہ کرنے میں وہ کمال دکھایا ہے کہ ایک طرف روح ایمان تازہ ہوتی ہے اور دوسری طرف ذوق شعر وجد کرتا ہے کہتے ہیں۔

عقل در پیچاکِ اسباب و علل | عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند | عقل مکّار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است | عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند | ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل محکم از اساسِ چوں و چند | عشق عریاں از لباسِ چوں و چند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن | عشق گوید امتحانِ خویش کن

اور سنئے اور لطف اٹھائیے۔

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد | کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد
نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس | بیا کہ عشق کمالے زیک فنی دارد

دیگر۔ از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ | عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند | عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

دیگر۔ زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ | کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

ایضاً۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق | عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ عشق وعقل۔ صداقت ومصلحت۔ حق وباطل۔ نور وظلمت کی آویزش کچھ دورِ حاضر سے مخصوص نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ابراہیمؑ اور نمرود۔ موسیٰؑ اور فرعون۔ محمدؐ اور ابوجہل کی منازعت بھی اسی کا کرشمہ تھی۔ عہدِ سعادت کے بعد واقعہ کربلا اس آویزش کی نمایاں ترین مثال ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں حسینؑ اور یزید کے معاملے کو اس زاویہ سے دیکھتی ہیں کہ ایک طرف ایک باجبروت بادشاہ ہے جس کی مدد پر فوجیں ہیں خزانے ہیں اور تمام وہ ساز وسامان شوکت ظاہری ہے جس کو استبداد خرید کر میدان میں لاسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے سروسامان ہستی ہے جس کے پاس "نہ لشکرے نہ سپاہے نہ کثرت الناسے"۔ دونوں کی جنگ کا نتیجہ قدرتاً اوّل الذکر کی فتح پر منتج ہوتا ہے۔ اور بس۔ لیکن غور کیجئے اس سے بڑھ کر بے بصیرتی اور کیا ہوگی۔ دراصل حق وباطل کی اس جنگ میں حقیقی اور دوامی فتح حسینؑ ہی کے ہاتھ رہی جنہوں نے اپنا سب کچھ عشق میں لٹا کر حیات جاودانی پائی۔ اور اُن کے مقابلہ میں یزید اور اس کے رفقاء کے حصے میں عارضی کامرانی کے باوجود ابدی ذلّت ولعنت آئی۔

موسیٰؑ وفرعون وشبیرؑ ویزید ‌ ‌ ‌ ‌ این دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیری است ‌ ‌ ‌ ‌ باطل آخر داغِ حسرت میری است
چوں خلافت^عہ رشتہ از قرآں گسیخت ‌ ‌ ‌ ‌ حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلۂ خیر الامم ‌ ‌ ‌ ‌ چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم
برزمینِ کربلا بارید و رفت ‌ ‌ ‌ ‌ لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد ‌ ‌ ‌ ‌ موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم ‌ ‌ ‌ ‌ ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

عہ ملاحظہ ہو شرح عقائد نسفی وغیرہ۔

عہ الخلافت بعدی ثلثون سنۃ الخ (الحدیث)

اس سے ثابت ہو گیا کہ اگرچہ عشق حیات ابد کا ضامن ہے تاہم کشمکش اور قربانی کے بغیر اُس کے جوہر نہیں کھلتے۔

عشق با دشوار ورزیدن خوش است — چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکنات قوتِ مردانِ کار، — گردد از مشکل پسندی آشکار،

ممکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ اقبال علم اور عقل کو انسانی ترقی کے لئے غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے ہیں یہ خیال صحیح نہیں۔ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر علم کے ساتھ ذوق وحرارت کی کمی ہے تو وہ علم ناقص ہے۔

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے — یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

اہل فرنگ کی علمی کوششیں اور عقلی کاوشیں کس پر مخفی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ نرے علم وعقل سے تو ایمان ویقین کی منزل تک پہونچنا دشوار ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا۔ زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا۔ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر عشق وعقل کے بارے میں مرشد روم کی رائے درج کردی جائے۔ جن کے روحانی فیضان کا اقبال نے نہایت بلند آہنگی سے ہر جگہ اعتراف کیا ہے۔ مولانا کا ارشاد ملاحظہ ہو۔ حق یہ ہے کہ عشق کی تعریف میں اس سے موثر تر پیرایہ خیال میں نہیں آسکتا۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما — اے تو افلاطون وجالینوس ما

عشق پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔

عشق در اول چرا خونی بود، — تا گریزد ہر کہ بیرونی بود
تو بیک خواری گریزانی ز عشق — تو بجز نامے نمیدانی ز عشق،
عشق را صد ناز واستکبار ہست — عشق با صد ناز می آید بدست

عشق و ناموس اے برادر راست نیست | بر درِ ناموس اے عاشق مایست،

عقل کی نسبت بھی مولانا کا فیصلہ وہی ہے جو آپ اقبال کے یہاں پڑھ چکے ہیں۔ البتہ مولانا نے اس جگہ تفریق و تفصیل سے کام لیا ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک عقل کی دو قسمیں ہیں۔ عقل جزوی اور عقل کلّی۔ عقل جزوی (ناقص) یا بہ الفاظ دیگر عقل معاش عشق سے محروم ہوتی اور اسباب ظاہر پر تکیہ کرتی ہے عقل کلّی (کامل) یا عقل معاد اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک سرتا سر بحث و استدلال۔ ظن و تخمین۔ نفاق اور مصلحت اندیشی کی خوگر ہے۔ دوسری فکر و ذکر۔ یقین و ایمان۔ صداقت و حق پرستی کی۔ ایک اہل دنیا کے حصّے میں آئی ہے۔ دوسری اہل اللہ کے۔

عقلِ جزوی را وزیر خود مگیر، | عقلِ کل را ساز اے سلطاں وزیر

عقلِ جزوی عقل را بدنام کرد | کامِ دنیا مرد را بے کام کرد

عقلِ جزوی عشق را منکر بود | گرچہ بنماید کہ صاحب سِر بود

گر بہ استدلال کارِ دیں بدے | فخر رازی راز دارِ دیں بدے

پائے استدلالیاں چوبیں بود | پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یہ تو ایک طرح کا جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم پھر علّامہ اقبال کے کلام کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عشق کا جس پر اقبال نے اس قدر زور دیا ہے مطلوب کون ہے۔ اس کا جواب خود اقبال ہی کے کلام سے ہم کو ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

مستِ چشمِ ساقیٔ بطحاستیم | در جہاں مثلِ مے و میناستیم

شورِ عشقش در نئے خاموشِ من | می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

من چہ گویم از تولّائش کہ چیست | خشک چوبے در فراقِ او گریست[1]

---

[1] اُستن حنّانہ کا واقعہ۔

ابرِ آذار است و من بستانِ او — تاکِ من نمناک از بارانِ او
چشم در کشتِ محبّت کاشتم — از تماشا حاصلے برداشتم
خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم — زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم
رشتۂ ما یک تولّائش بس است — چشمِ ما را کیفِ صہبائش بس است
عشقِ او سرمایۂ جمعیت است — ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

فی الحقیقت عشق محمّد (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کے مرض کی دوا ہو سکتا ہے اور یہی رشتہ اُن کے منتشر شیرازہ کو پھر یکجا کر سکتا ہے۔

ایک جگہ سرورِ عالم سے مخاطب ہو کر استغاثہ کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشعار میں سوز و بے تابی کی بجلیاں کوندرہی ہیں۔

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور — قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزلِ ہر راہرو — جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو
سازِ ما بے صوت گردید آنچناں — زخمہ بر رگ ہائے او آید گراں
در عجم گردیدم و ہم در عرب — مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست — در دلش لا غالب الّا اللہ نیست

اقبال نے ایک کامل نبّاض کی طرح ہمارے مرض انتشار و افتراق کی صحیح تشخیص کی اور اُس کے لئے دوا بھی تیر بہدف تجویز فرمائی یعنی عشق رسولؐ لیکن وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ایک ہمدرد طبیب کی مانند "پرچہ ترکیب استعمال" بھی عنایت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطام در تقلید فرد | اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی، محکم شو از تقلیدِ یار | تا کمندِ تو شود یزداں شکار

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مسلم کی دینی اور دنیاوی رفعت کے لئے اس سے بہتر لائحہ عمل کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ ملت اسلام میں افراط و تفریط سے جو مفاسد راہ پا گئے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ اقبال سا دیدہ ور اس موقع پر تنبیہ کے فرض سے غفلت کرتا۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ ہیں جو محبت میں غلو روا رکھتے اور اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں۔ دوسرے اتباع میں تشدد برتتے مگر محبت سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ دونوں راہیں کعبے کی بجائے۔ ترکستان کیطرف لیجاتی ہیں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ ایک طرف حقیقت محمدیہ کو جو محبوبیت مطلقہ کا مظہر اتم ہے اپنے ماں باپ۔ اولاد اور تمام جہان سے عزیز سمجھے اور دوسری طرف آپکے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے میں شمع راہ بنائے۔ اِنَّ المُحِبَّ لِمَن یُّحِبُّ مُطِیعٌ ورنہ ظاہر ہے کہ محبت بے اتباع منافقانہ غلو ٹھہرگی اور اتباع بے محبت خشک تقشف۔

بیانات و اقتباسات بالا سے (جن میں بخوف طوالت استقصاء کی کوشش نہیں کی گئی ہے) صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی ترقیوں کا کفیل اور نیابت الٰہی کے منصب رفیع پر فائز ہونیکی سبیل اگر کوئی ہے تو وہ عشق ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان ہی نہیں۔

طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

عہ حضرت بایزید بسطامی کے خربزہ نہ کھانے کا واقعہ۔ عہ یہ الفاظ و تراکیب قواعد کے لحاظ سے نہیں بلکہ "ادب" کے اعتبار سے ضرور کھٹکتی ہیں۔ مگر۔ دانکہ ایں پیمانہ معنی بود ۔ گندمش بستاں کہ پیمانہ است رد۔ سہ دیکھو حدیث

چین اس قدر قوت کا مالک نہیں جو اس سیل بے پناہ کو روک سکے لہذا اس کو فنا ہو جانا چاہیئے۔ اس سے غرض نہیں کہ کتنی بیگناہ جانیں اس مہیب دیوتا کی نذر ہو جائینگی، کتنی مجبور عورتیں بیوہ اور کتنے معصوم بچے یتیم اور لاوارث رہ جائینگے، نہ اس سے کچھ مطلب کہ سرسبز اور شاداب کھیت ویران اور بنجر بن جائینگے، آبادیاں بن ہونگی اور جہاں انسانوں کے دم سے رونق ہے وہاں بوم اور شغال کا گذر ہوگا، نہ اس کی پرواہ کہ چین جو دنیا میں تہذیب کا سب سے پرانا خادم اور پہلا علمبردار ہے اور جس نے ہمیشہ مرنج مرنجان، کی پالیسی پر عمل کیا ہے اس قابل ہے کہ اطمینان اور سکون سے اپنی قوتوں کی شیرازہ بندی کر کے عصر حاضر سے ہم آہنگ ہو سکے۔

بہرحال وطنیت کے صدقے میں انسانوں نے پھر درندگی اور خونخواری کا درس لیا، اسلام جو سلامتی اور امن کا مذہب ہے، وطن کے اس تخیل سے اختلاف کرتا ہے۔ اسلام ایک عالمگیری اخوت کا قایل ہے جس میں ہندی اور ایرانی، ترکی اور خراسانی، چینی اور عربی کا کوئی فرق اور امتیاز نہیں رہتا، جس چیز کو لیگ آف نیشن آج حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ اسلام اُس کا نمونہ اب سے تیرہ سو سال پہلے پیش کر چکا ہے[۱]۔

ہندی مسلمان بھی عرصہ تک اس پرکار بند رہے، لیکن اپنے دور زوال میں وہ بھی زمانے کی رو کے ساتھ بہ گئے کانگریس نے اپنی کامیابی کے لئے مسلمانوں کے اشتراکِ عمل کو ناگزیر سمجھا، لیکن وہ مسلمانوں کی علیحدہ جماعتی حیثیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، مسلمانوں کو یہ خطرہ ہے اور یہ خطرہ بے بنیاد بھی نہیں کہ کانگریس میں اور خود ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اگر اس وقت انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت کو قایم نہ رکھا تو پھر ان کی زندگی اس ملک میں دشوار ہو جائیگی اور وہ اکثریت سے مغلوب اور مرعوب ہو کر اسی میں مدغم ہو جائینگے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو علامہ موصوف کا گرامی نامہ مسئلہ جہاد پر۔

مسلمانوں کو شامل کرنے کے لئے کانگریس نے بارہا کوشش کی اور اب سے چند سال پہلے یہ کوشش کامیاب بھی رہی سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے دوش بدوش بڑی سے بڑی مالی اور جانی قربانی کرکے کانگریس کو اپنے خون سے سینچا اور اُس کا حاصل جو کچھ مسلمانوں کو ملا وہ یہ کہ جب کانگریس نے اپنی غلط فہمی سے خود کو برسر اقتدار سمجھا تو مسلمانوں کی جماعتی حیثیت سے منکر ہوگئی اور مہاتما گاندھی جو کبھی خالص ہندوستانی تھے اب کھُلم کھُلا مہاسبھائی بن بیٹھے، کانگریس نے تحریراً اور تقریراً تو وعدہ یہ کیا تھا کہ کانگریس فرقہ وارانہ رنگ کبھی اختیار نہ کرے گی۔ لیکن مہاتما گاندھی نے جب ہندوستان کو ہندو اور مسلمانوں کی متفقہ قربانی سے جنگ آزادی کے لئے تیار کرالیا تو اپنی ظاہری نقاب کو اُلٹ کر اصلی روپ میں آگئے اور اچھوت ادھار اور دوسرے ذرائع سے خالص مہاسبھائی ذہنیت کا اعلان کرنے لگے۔

لطف تو یہ ہے کہ مہاتماجی کانگریس کے چار آنے والے بھی ممبر نہیں لیکن کانگریس کی گاڑی جس میں مسلمانوں کو صرف بیل بنا کر جوتنے کی کوشش ہو رہی ہے مہاتماجی کے اشارے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتی اور وہ لیڈر بھی جو انقلابی، اشتراکی اور سب کچھ کہلاتے ہیں۔ مہاتماجی کے آگے کان نہیں ہلا سکتے اور ان کی تمام انتہاپسندی پانی ہو جاتی ہے۔ کانگریس کے پنڈال میں شان و شوکت اور ہنگامہ آرائی تو بہت کچھ ہوتی ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو مہاتما کا ارشاد ہوتا ہے۔

یہ ایک چیز اپنی جگہ مستقل ہے، اب آگے چلئے، زبان کے مسئلہ میں کانگریس نے "ہندوستانی" کو ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان سمجھا ہے اور اپنے دستور میں اسے تسلیم کیا ہے، رسم الخط سے معاملہ میں ناگری اور فارسی دونوں کو قابل قبول کہکر بظاہر بڑی رواداری کا ثبوت دیا ہے۔

لیکن یہی ہندوستانی کانگریس کے گرو گھنٹال پنڈت موہن داس کرم چند گاندھی کی صدارت میں "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی قلابازی کھا کر اُردو سے دور اور ہندی کے

قریب جا پڑتی ہے، ناگپور والا سہتیہ سمیلن کا اجلاس ابھی لوگوں کو بھولا نہ ہوگا کہ مولوی عبدالحق نے جو اُردو کو بھی اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق دیگر ہندوؤں سے کٹھ ملا کا خطاب لینا چاہتے ہیں اس پر بہت کچھ واویلا کیا اور خود کانگریس کے صدر کو متوجہ کرنا چاہا لیکن چونکہ وہ صلاح کار گٹھ کٹے ہوتے ہیں انھوں نے اس نازک مسئلہ پر اپنی اظہار رائے کو نامناسب سمجھا۔

اُردو کو مسلمانوں کے سر زبردستی ڈالا جا رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُردو بولتی اور سمجھتی ہے، لیکن گاندھی جی کو اس پر اعتراض یہ ہے کہ قرآنی حروف میں لکھی جانے والی زبان کیسے ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے، مسلمان تو بیچارے پہلے سے ہی ڈنڈت اور پاپی تھے اس زبان پر بھی جو اسی ملک کی پیداوار ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی ربط و ارتباط سے ظہور میں آئی نزلہ گرنا شروع ہوا۔

یہ کہہ لیجئے کہ کانگریس کو اصولاً سہتیہ سمیلن سے کوئی علاقہ نہیں، لیکن اہل نظر سے یہ پوشیدہ نہیں کہ یہ صرف لفظی ہیر پھیر ہے حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ اس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ ہری پورہ میں جو کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور اس سلسلہ میں نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تو تمام اشتہارات اور اشیائے متعلقہ میں دیوناگری اور گجراتی رسم الخط نظر آتا تھا، یہ بیان خود کانگریس کے طرفدار "مدینہ" اخبار کا ہے جو پچھلے یو۔پی اسمبلی کے الکشن میں اپنی وفاداری کا حلف اٹھا چکا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر کیجئے اور خالص سیاسی معاملات پر آجایئے کانگریس نے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی اور وزارت قبول کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا، پہلے کانگریس اسمبلی اور کونسل کے انتخاب میں حصہ لینا اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتی تھی، لیکن جب یہ سمجھا کہ حکومت کا دست راست بنکر زیادہ قوت اور شوکت حاصل ہو گی تو اپنے اصول کو شکست کر کے برطانوی اقتدار اور استبداد کی معاون بن بیٹھی اور موقع ملا تو کرسی وزارت پر بھی جم گئی۔

یو۔پی میں ایک بزرگ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے اور لیگ کی کوششوں سے کامیاب ہوئے تھے، وزارت قبول کر کے اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور کانگریس میں غیر مشروط شرکت قبول کر لی، جب مسلمانوں نے زیادہ لے دے کی تو اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا، لیکن وزارت پر قائم رہ کر دوبارہ انتخاب کے میدان میں اُتر آئے۔

اس انتخاب میں کانگریس نے جو اوچھے ہتھیار استعمال کئے اُن کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے تاہم کامیابی ان کے ہاتھ رہی اور وقتی طور پر کانگریس کی کھلم کھلا فتح نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو اس پر اعتماد ہے۔

لیکن بعد کے ضمنی انتخابات میں پانسہ بالکل اُلٹ گیا اور مسلم لیگ نے اپنی پے بہ پے فتح سے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی دم باقی ہے اور وہ اپنی حفاظت سے غافل ضرور ہو گئے تھے لیکن طاقت ان میں باقی تھی اور باقی ہے۔

ان ہنگاموں نے ایک نہایت اہم مسئلہ غور و فکر کے لئے پیش کر دیا ہے کانگریس والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس ملک میں کوئی جماعتی حیثیت ہو یا نہ ہو، کانگریس میں وہ صرف ہندوستانی بنکر شامل ہو سکتے ہیں، مذہب کا خرقہ دیرینہ پہن کر اسمیں داخل ہونا دشوار ہے۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور پھر کچھ اور۔ کانگریسی بزرگ کہتے ہیں کہ قوم کا تخیل وطن پر تعمیر ہوتا ہے، مسلمان اس کی بنیاد اپنے مذہب پر سمجھتے ہیں۔

چنانچہ دہلی میں حسین احمد صاحب کی تقریر کا بھی لب لباب یہی تھا۔ علامہ اقبال نے اس کو سنکر ایک قطعہ لکھا۔ اس کی مخالفت اور موافقت میں جو قطعات نکلے وہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

قطعہ

(علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال)

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بیخبر ز مقامِ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم است

بمصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

قطعہ

(از جناب محمد اصلح صاحب الحسینی انصاری)

حکیم مشرق و دروام سوقیاں افتاد
بہ سوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مگر ز سراداءِ کم بنود آگاہ
چہ بے خبر ز رموز شریعت عربی است

کفی لہ کذ با ان یقول ما سمعہ
بگفتہ اند چنیں ہم زگفتہ ہائے نبی است

حدیث دامن یزدان و چاک را چہ لقب
چو امتثال محمدؐ عیار بولہبی است

مقام خویش ندانند و طعنہا بہ خطیب
ادب نگاہ ندارند ایں چہ بیخردی است

بہ ذروۂ کہ زند بال فکر قوالے
اثر گذاشتہ ہائے مہاجر مدنی است

قطعہ

(از جناب شوکت صاحب سبزواری ایم۔ اے)

چو با خبر نۂ ز اسرار ملّتِ بیضا
ترا رسد کہ شناسی محمدؐ عربی

شگفت نیست اگر شاعری نمی داند
مقام مطلبی از مقام بولہبی

ہر آنکہ نقش گر لفظ و غافل از معنی
زبان طعن کشاید چرا بہ بے ادبی

بہ بزم خلوتیاں پا بنہ کہ جا اینجاست
ادا شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

قطعہ

(از علّامہ شمس الحق شیخ المعقول دیوبند)

نظام قوم بدو گونہ می شود پیدا
اگر ہنوز ندانی کمال بولہبی است

نظام ملّت واحد بہ اختلاف بلاد
قوام گیر از جذب محمد عربیؐ است

نظام دوم کہ قائم میان صد ملل است
نظام وحدت ملکی است ایں چہ بوالعجبی است

قطعہ

(از جناب اقبال احمد صاحب سہیل)

کسے کہ خردہ گرفت است بر حسین احمد
زبان او عجمی و کلام در عربی است

کہ گفت بر سر منبر کہ ملّت از وطن است
دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است
کہ مستفاد ز فرمودہ خدا و نبی است

زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی،
کہ فرق ملّت و قوم از لطائف ادبی است

تفاوتیست فراواں میانِ ملّت و قوم
یکے ز کیش و دگر کشوری است یا نسبی است

بہ ملّت ارچہ براہیمی است سرورِ ما
ولے بہ قوم حجازی بہ نسل مطلبی است

ز قوم خویش شمرد اہل کفر را بہ احد
رسولِ پاک کہ نامش محمد عربی است

خدائے گفت بہ قرآں لِکُلِّ قومٍ ہادٍ
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

بہ قوم خویش خطابِ پیمبراں بنگر
پُر از حکایت یٰقومِ مصحفِ عربی است

بلند تر بود از قوم رتبۂ ملّت
کہ حبلِ دیں قوی تر ز رشتۂ نسبی است

کسے کہ ملّتِ اسلام نورِ سینۂ اوست
برادر است اگر زنگی است ور حلبی است

مگر بہ ہموطناں در جہادِ استخلاص
مجاہدانہ تعاون ز روئے حق طلبی است

سلوکِ رفق و مدارا بہ جار و ذی القربیٰ
عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است

محبت وطن است از شعائر ایماں
ہمیں حدیث پیمبر فدیتہ یابی است

نظارہ بودن و بادیدہ ور در افتادن
دوگونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است

رموز حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن
تلاش لذّت عرفاں ز بادۂ عنبی است

خموشی از سخن نا سزا گزیدہ تر است
کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است

بہ دیوبند گرا گر نجات می طلبی
کہ دیو نفس سلحشور و دانش تو صبی است

بہ گیر راہِ حسین احمدؐ از خدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبی است

قطعہ

از جناب سبطین احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

عجب کہ اہل بصیرت ہنوز بے خبر اند
چہ فتنہ ہا پسرِ تفریق قومی و نسبی است

تفاوتیست گر فہم میانِ ملّت و قوم
یکے ز رنگ و وطن دیگر از خدا طلبی است

یکے بہ باد دہد وحدتِ بنی آدم
کہ نسل ایں ز صفاہاں و اصل آں ز لبی است

دگر یگانہ شمارد صہیب و سلماں را
نسنجد ایں کہ فلاں اعجمی است یا عرابی است

بجا است ایں کہ ز باطل جہاد در رہِ حق
شعار مسلم و فرمودۂ خدا و نبی است

تعاونے بہ حلیفے بہ کارِ خیر و حسن
ہم آیتے است کہ وارد بہ مصحفِ عربی است

ولے ز قوم و وطن بتکدہ بنا کردن
ز شیوہ ہائے ابوجہلی و ابولہبی است

ز اشتراکِ وطن گر بنا کنی قومے
بغیر وحدتِ فکر و عمل چہ بوالعجبی است

وگر بخواہی کہ خیزد ز ہند نسلِ جدید
بہ اختلاط شعائر ہمیں زیاں طلبی است

بمدرسہ نہ بری زینہار شہرِ حکیم
کہ کار مدرسہ تعلیلِ لغوی و ادبی است

ملّت و قوم

(از جناب غلام سجاد صاحب بسمل)

تو اے کہ کذب شمردی کلام صاحب دل   نگاہ تو عجمی و کلام او عربی است
سخن از تو باہمہ الفاظِ دیں حمایت کفر   عجب نداشتہ ام تابش سہیل شبی است
نصوصِ حق پے تاویل باطل آوردن   چہ غیر شیوہ تلبیس و رسم بولہبی است
براستی۔ کہ بجز حق نگفتہ است اقبال   مگر بہ پیش تو منظورِ قوت غضبی است
سخن از برائے عتابت سبب شناختہ ام   بگویم ایں کہ عتابت بر او ز بے سببی است
ملال خاطرت "الحق مرّ" آمدہ[1] است   بکام اہل حق آں را حلاوت رطبی است
سخن ز درد دل خویش گفتہ است اقبال   نہ آں لطیفہ شعرے نہ نکتہ ادبی است
مجو ز فطرت اقبال لفظ آرائی   فغان خاطرِ غمگیں نہ نغمہ طربی است
بلند فطرت او پے بسوئے معنی برد   یقین شناس کہ بر لفظ بیجد آنکہ غبی است
مگر ازاں بغلط داشتش صبی خواندی   کہ ہست قلب سلیمش بہ عصمتے کہ صبی است
تفو بماہ فگندی بچہرہ تو فتد   کہ تو فتادہ بجائی علوِ او وہبی است
کنی بہ اہل دلے نسبت دروغ دریغ   مگر برائے کہ خود ایں شعار مکتبی است
بچشم سر نگری گاہ چشم دل بکشا   مگر بہ قلب سلیمش چہ مایہ حق طلبی است
گہے دروغ نگوید کسے کہ آزاد است   دروغ از او بشنو کو بہ دست غیر سببی است
چو اعتماد بہ تیج است خود محدث را   بہ تیج ہیں کہ چہ فاش آں حدیث زیرلبی است

---

[1] روزنامہ انصاری مورخہ ۱۹ شتہ ۶۳ نامہ مولوی حسین احمد" میں اس تحریف اور اتہام کو دیکھکر چپکا رہ گیا اور تقریر کا بڑا حصہ انصاری اور تیج میں بھی چھپا"

بگفت "می نبود قوم[1] ہا ز مذہب و رنگ
وے ز ملک و وطن ہست" ولے چہ بوالعجبی است

کنوں کہ نامہ او دیدہ ام بہ انصاری[2]
بگفتہ "مذہبی و ملکی است" و ہم نسبی است

بگفتہ است کہ "از رنگ قوم می خیزد"
کہ ایں چو سنگِ سیہ واں چو شیشہ حلبی است

بچند قول تناقض عیاں ہمی بینم
چو ایں ز ہادی دیں نبی است بوالعجبی است

کدام کذب کدام است راست می دانی
تو حق بپوش و بکس ہم بگو کہ بے ادبی است

بنائے قوم چناں می فتد چرا گفت است
محدثے کہ سبب جُستنش ز بے سببی است

مراد چیست ز "بنتی ہے یا نہیں بنتی"
زمن بپرس کہ آں نیز نکتہ ادبی است

مرادش اینکہ ز مذہب فلاح قومی نیست
ولے ز ملک و وطن ہست وے چہ بوالعجبی است

خود او ز کیش کند قوم را بنا تسلیم،
تو گفتہ کہ ہمیں کشوری است یا نسبی است

گواہ چیست درایں قول و مدعی سست است
پس ایں لطیفہ[3] قانونی است یا ادبی است

زبان طعن کشودی بفرق ملّت و قوم،
بہ بند لفظ فتادی ز فہم خود کہ صبی است

ز ملّت امت مسلم مراد اقبال است
کہ قوم نزد محدث ز اتباع نبی است

دگر برائے چہ گفتہ کہ آں ز مذہب نیست
مگر برائے جو اہر سرزباں طلبی است

اگر ز دیش بود قوم باز رو بہ عرب
کہ ہند از پے ہندو۔ نژاد تو عربی است

۱۔ اخبار تیج مورخہ ۱/۲ ۳۸ء "آج قومیں مذہب اور رنگت سے نہیں بنتیں بلکہ دیش اور ملک سے بنتی ہیں"

۲۔ روزنامہ انصاری دہلی ۱۸ ذی الحجہ ۵۶ھ مطابق ۱۹/۲ ۳۸ء

۳۔ مولانا سہیل سربرآوردہ وکیل اور بلند پایہ ادیب ہیں۔

ازاں خطاب بہ "یقوم" مرسلاں کردند
کہ ردِّ نصح زبیگانگاں شعارِ ابی است
نبی ما ز کرم گرچہ "اھدِ قومی" گفت
ندانی ایں کہ ز نسبت چہ مدعائے نبی است
دعا ز نسبت اُو شد قریب تر بہ قبول
کمال مرحمتش شانِ مرحمت طلبی است
بہ اینہمہ تو اگر بہرہ از ادب داری
بگو کہ طائفہ کافراں ز قوم نبی است

بما ز رفق و مدارا سخن چہ میگوی
بہ دیں پاگ نہ غلظت نہ رفق بے سببی است
بہ "بینہم رحما" اقتدا کند مومن
ازاں کہ غایت آں اہتدا براہ نبی است
ولی مومن اگر می شود بجز مومن
بمن نما کہ ز فرمودۂ خدا و نبی است
مجاہدانہ تعاون بما کہ ہم وطنیم
چرا حرام شد آخر نہ بادہ عنبی است
قوی است حبل متین گاہ اعتصام بخواہ
مرو براہ تفرق کہ آں زیاں طلبی است
بیاد آر گہے امرِ جاہد الکفار
کہ آں بقائے ترا ضامن است و رسم نبی است
بگو بہ کافر ہندی خلوص اینہمہ چیست
نہ کافر و طنت مثل کافر آرِبی[1] است
گرفتہ تو از ایشاں کدام عہد وفا
زخویش خیط غلامی نہ آشتی طلبی است

شمردہ است محدث ز ملک و دینش اب دام
ندانم از کہ تو گوی کہ اُو ز آل نبی است
تو آنہ "عمل غیر صالح" خواندی
بہ طفلی تو۔ کہ وارد بہ مصحفِ عربی است
اگر براہ نبی نیست کس چہ ہیچ زد،
ازاں کہ اُو مدنی و بہ نسل مطلبی است
نبردہ نام سیادت ادب نگہ دارم
اصول سنج کہ فرمودہ خدا و نبی است

---

[1] یورپین مراد ہے بضرورت شعر تصرف کیا ہے۔

خدائے پاک چو فرمود لیس من اهلك   به کفر و دین مبین قطع نسبت نسبی است
گر او ز آل نبی هست ارنشش برسال   سر شعر من که از او این گذارشم ادبی است
گمان مدار که آیے بروے کار آرد   به اهل نار تولا که عین بولهبی است
ثبات کفر ندارد بپاے خویش بایست   چه اعتماد بپائے دگر که هم خشبی است

گر آسیاے کس از آب زر همی گردد
نظر مکن که ترا نیز آبرو ذهبی است

ملّت و قوم

(از جناب مولانا یعقوب بخش صاحب راغب البدایونی)

کسے کہ خاست پئے نصرت حسین احمدؐ — قیامتش آفت دینی و لغزش ادبی است
بعقل سوختہ مدبر حریف مقبل شد — مگر بہ شمس نہار احتراق نجم شبی است
خیال درک سخن از کسے چہ باید کرد — کہ اُو زیار سیاں است و گفتگو عربی است
کہ گفت بر سر ممبر دروغ میدانی — دروغ گفتن و تکذیب ایں چہ بوالعجبی است
غلط سرود محدث کہ قوم از وطن است — چراکہ مسلم و قومیتش ز دین نبی است
زملت آمدہ اہلش مرادِ علامہ — "مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است
بگیر اہل زملت چو "واسئل القریہ" — بداں کہ حذف مضاف از لطائف ادبی است
بیار نصِ صریحے کہ اُمت از وطن است — بخواں حدیث صحیح کہ قوم ما نسبی است
غلط نواختہ در فروق ملت و قوم — "یکے ز کیش و دگر کشوری است یا نسبی است
یکے است دین، نہ ز دین۔ دین ز دین چہ می باشد — دگر جماعت وصفی و جنسی و نسبی است
دو قوم مومن و کافر بیک بلد بنگر — بمصر و مکہ نظر گر بمصحفِ عربی است
وقومُ کلِ نبیٍ یکون امتہ — خطاب شاں نہ ز ہم کشوری و ہم نسبی است
بغیر قوم نباشد وجود ملت را، — چو قوم دیں محدث مگر وطن سببی است
کہ می برد سخن حق بہ دیوبند از ما — بہ اہل نار موالات عین بولہبی است
محدثے کہ زہر و خریدہ لہو حدیث — بے روایت آں تارک حدیث نبی است
خوداُو مقر شدہ ادنےٰ ز ہندیاں ہستم — کہ گویدش مدنی ہست و ہم ز آل نبی است؟
چساں بود مدنی کو مدینہ را بگذاشت — بہ ہندیاں سر ہم ملکیش چو ہم نسبی است

نشین براہِ محدث لطیبہ بازش آر
کہ این تتبع نہر و خلاف راہ نبیؐ است

اس مسئلہ کے متعلق ہم اپنے خیالات کا اظہار کر چکے یعنی محض وحدت وطنی ایک قوم کی بنیاد نہیں ہو سکتی، لیکن اس پر اتفاق اور اختلاف کی گنجائش ہے، ہمیں شکایت ہے تو اس لب ولہجہ کی جو بعض اشعار میں علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد جیسی ہستیوں کے متعلق اختیار کیا گیا ہے۔

(لیث)

اقبال

(حفیظ نقشبندی برہانپوری متعلم بی۔اے)

نغمۂ عبرت سے پُر تیرا ربابِ زندگی
ہر نفس تیرا پیامِ انقلابِ زندگی

تو نے اِس انداز سے لکھدی کتابِ زندگی
ہر ورق گویا کہ ہے تفسیرِ بابِ زندگی

پھونکدی تو نے تنِ مسلم میں اک روحِ حیات
پیکرِ بیجاں کو بخشی آب و تابِ زندگی

جگمگا اٹھی نظر کے سامنے تصویرِ طُور
تو نے ہم سب کو پلا دی وہ شرابِ زندگی

ہے درخشاں ہر طرف تیرے تخیل کی ضیا
قوم کے گردوں پہ تو ہے آفتابِ زندگی

ہم ہیں تاریکی ہے پُر ہول و خطر ہے راستہ
تو ہمارے واسطے ہے ماہتابِ زندگی

ہم کو سوتے سے جگایا تو نے اے خضرِ طریق
کردیا بیچین دیکر اضطرابِ زندگی

کاروانِ قوم کی بانگِ درا اقبال ہے
قوم کی کشتی کا واحد ناخدا اقبال ہے

تیرے اشعارِ حکیمانہ نگارِ زندگی
تو جہانِ علم و حکمت کی بہارِ زندگی

تیری ہستی مایۂ صد افتخارِ زندگی
تیرے ہاتھوں سے ہوا قایم شعارِ زندگی

مشرق و مغرب میں ہے تیرا تخیل جلوہ گر
اے تری ذات ہمایوں رازدارِ زندگی

تیرے میخانے میں ہے عطار و رومی کی شراب
ہے ترے ساغر میں کیفِ اعتبارِ زندگی

فارسی علم و ادب کے اے درخشندہ گہر
ہر نفس میں تیرے پنہاں ہے شرارِ زندگی

تیرے اشعارِ حکیمانہ کا دیکھا یہ اثر
ذرہ ذرہ بن گیا آئینہ دارِ زندگی

باغِ ملت میں نفس تیرا نسیمِ جانفزا
جس کے دم سے ہے شگفتہ لالہ زارِ زندگی

تقویتِ ملت کو تیری حکمتِ محکم سے ہے
سچ تو یہ ہے قوم کا اقبال تیرے دم سے ہے

نقد و تبصرہ

(ہم معذرت خواہ ہیں کہ اقبال نمبر کی تیاری، اور بعض دیگر اہم مصروفیتوں کے باعث ہم اس مرتبہ تمام موصولہ کتب اور رسائل پر تبصرہ شامل نہ کر سکے اور نہ جائزہ تصانیف زبان اُردو ۱۹۳۶ء کی دوسری قسط پیش کر رہے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری ہو جائیگی)

ہدیہ اخلاص بحضرت اقبال، از محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ۔ ناشر عبد اللطیف اعظمی

اس چھوٹے سے رسالے میں یحییٰ صاحب کی دو نظمیں "خطاب بہ شاعر حکیم ہند" (جو جامعہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکی ہے) اور شاعر مشرق اور فلسفۂ حیات ملّی شامل ہیں۔

پہلی نظم میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی حکیمانہ شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے لیکن آخر میں شاعر کی طرف سے ایک شکوۂ بے اختیار بھی شامل ہے۔ دوسری نظم بطور کفارۂ گناہ کے لکھی گئی ہے جس میں علامہ کی شاعری اور تعلیم کو سراہا گیا ہے۔

نظمیں دونوں کامیاب اور رواں ہیں، بعض اشعار بیحد شگفتہ ہیں ہم یحییٰ صاحب اور عبد اللطیف صاحب دونوں کو اس ہدیہ اخلاص، پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(لیث)

شرع محمدی منظوم | از سلمان احمد صاحب ہلالی، قیمت ۸؍ محلہ سوتھ بدایون کے پتہ پر ناظم صاحب سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک مختصر منظوم رسالہ ہے جس میں شرع محمدی یعنی (Muslim Law) کو نظم کیا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ہماری درسیات میں اکثر ایسی منظوم کتابیں شامل ہوتی تھیں جن سے واقعات، لغات اور اصولِ قواعد حفظ کرنے میں مدد ملتی تھی لیکن تعلیم کا نقطۂ نظر بدلنے کے بعد اس طرز کی کتابیں مقبول نہیں رہیں اور عرصہ سے اس قسم کی کتابیں دیکھنے میں نہیں آئیں

سلمان صاحب ایک نوجوان شاعر ہیں جن کا کلام اکثر بریلی کالج میگزین میں شائع ہوتا رہا ہے۔ موصوف نے اب ایل ایل۔ بی کی ڈگری لیکر کالج کو خیرباد کہا ہے اور اپنے وطن بدایوں میں وکالت شروع کی ہے اسی پیشہ کی مناسبت اور فطری ذوق کی اعانت سے آپ نے شرع محمدی کو منظوم کیا ہے اور موصوف کا خیال ہے کہ اس سے قانون کے نکتے دماغ میں محفوظ کرنے میں مدد ملیگی

مجموعی حیثیت سے یہ منظوم کتاب دلچسپ ہے اور سلمان صاحب کی شاعرانہ قدرت کا اس سے اچھا اندازہ ہوتا ہے، ہر چیز کا مفہوم بالکل واضح کر دیا ہے اور اکثر فٹ نوٹ میں تشریح بھی کی ہے دلچسپی رکھنے والے حضرات سلمان احمد صاحب ہلالی سے طلب کر سکتے ہیں۔

(لیث)